جنوری 2009

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

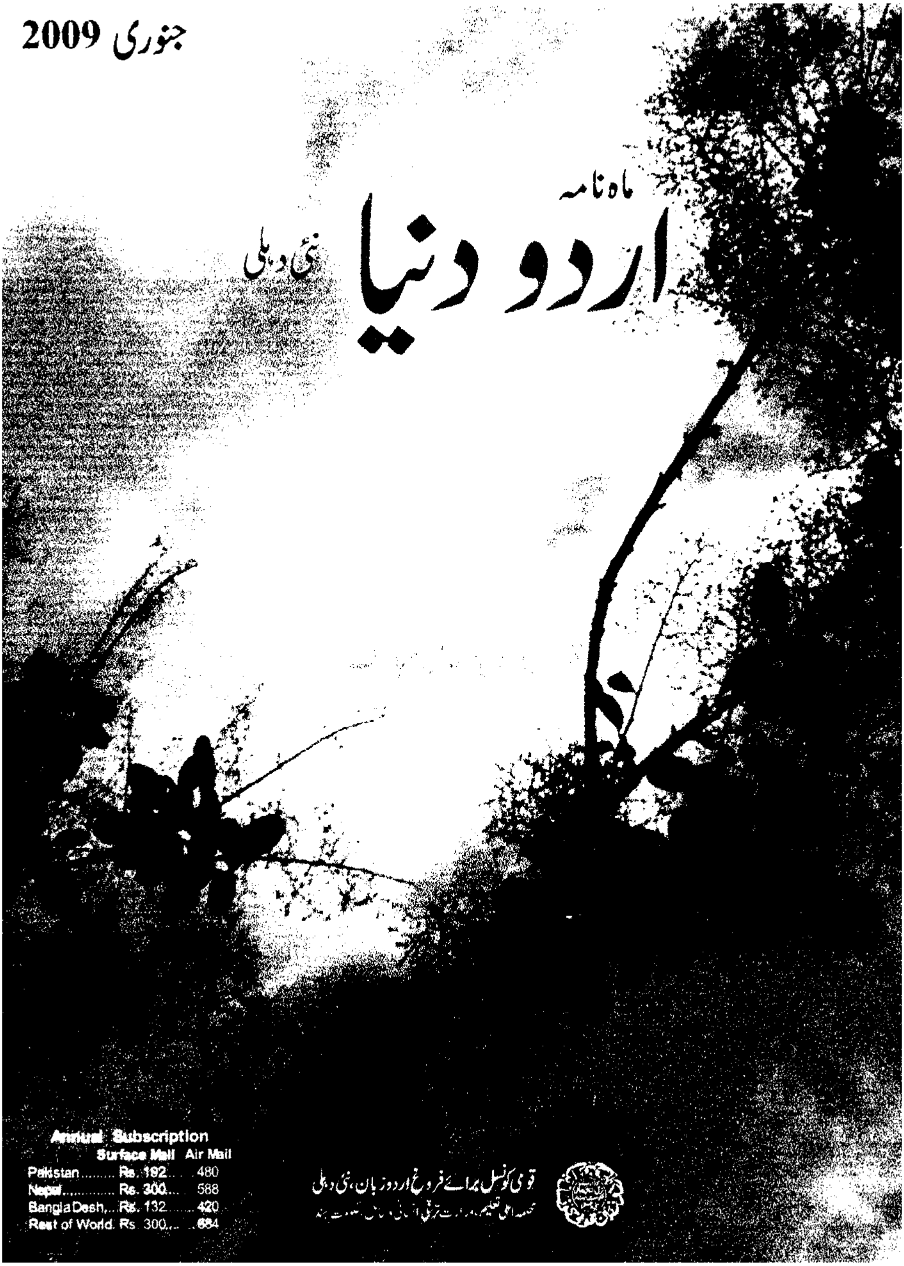

Annual Subscription

	Surface Mail	Air Mail
Pakistan	Rs. 192	480
Nepal	Rs. 300	588
BanglaDesh	Rs. 132	420
Rest of World	Rs. 300	684

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

محکمہ اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

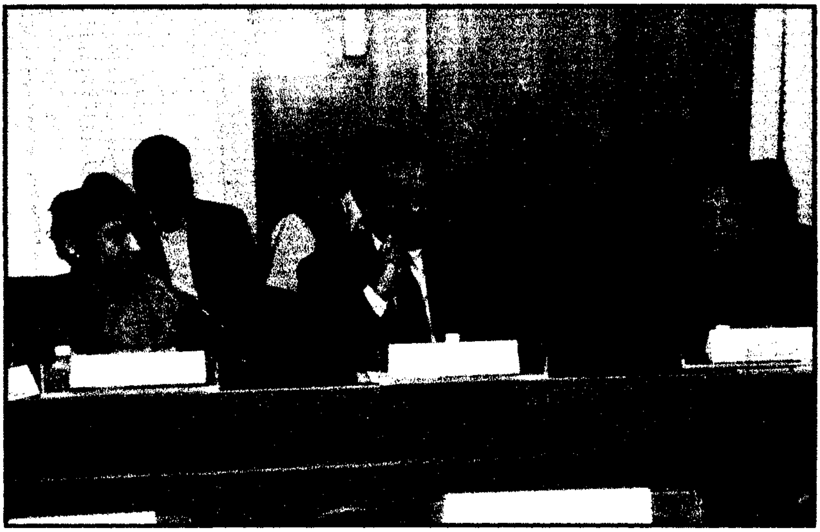

قومی اردو کونسل کی جنرل باڈی کی میٹنگ 6 دسمبر کو کمیٹی روم، شاستری بھون میں کونسل کے وائس چیئرمین جناب چندر بھان خیال کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ تصویر میں (دائیں سے) محترمہ رینا چٹرجی، ڈائرکٹر لنگوئج، جناب سنجیو متل، نمائندہ فائننشیل ایڈوائزر اور محترمہ انیتا بھٹناگر جین، جوائنٹ سکریٹری، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
پچھلی صف میں محترمہ مسرت جہاں، ریسرچ اسسٹنٹ، قومی اردو کونسل، جناب ایس موہن، ڈائرکٹر فائننس، وزارت ترقی انسانی وسائل۔

میٹنگ کے دوران (دائیں سے) جناب رام جن شرما، نمائندہ این سی ای آر ٹی، ڈاکٹر علی جاوید، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل اور ڈاکٹر اودے نرائن سنگھ، ڈائرکٹر سی آئی آئی ایل میسور۔

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد-11، شمارہ-1، جنوری 2009

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر.کے. پورم نئی دہلی- 066 110
فون:26103938, 26103381
26179657 فیکس:26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urdudunlyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066
فون:26169416, 26109746

شاخ:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، چھتہ گلی، حیدرآباد-500002
فون:24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات .... ادارہ 3

زبان، ادب اور تعلیم

● ہندوستان میں اردو کے ساتھ ناانصافی .... مارکنڈے کاٹجو/ امتیاز وحید 4
● اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا .... مجتبیٰ حسین 7
● قومی درسیات کا خاکہ—2005 .... محمد نعمان خاں 9

صحافت، سماج اور تاریخ

● عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں صوفیائے کرام کا رول .... اقتدار حسین صدیقی 12
● موپلا ویگن ٹریجڈی .... انیس چشتی 17
● ریشمی رومال کی تحریک: آغاز و انجام .... شیریں زباں خانم 20

شخصیات

● حفیظ بنارسی— شاعر اور نثر نگار .... ابرار رحمانی 23
● امداد امام اثر اور مطالعۂ میر .... سرور الہدیٰ 26

ماحولیات اور صحت

● آلو کا عالمی سال 2008 .... محمد خلیل 31
● چاند پر انسانی بقا کا سوال .... کائی گوگ لیونا 32

کیریئر

● بایوٹیکنالوجی میں کیریئر .... خان قمر الزماں 37

روبرو

● ظفر گورکھپوری سے گفتگو .... شجاع الدین شاہد 38

ہماری مطبوعات سے

● اکبر کی حکومت کا چوبیسواں سال .... ملا عبد القادر بدایونی 41

اردو خبرنامہ .... ادارہ 45

تبصرہ و تعارف

● تعلیمی تشکیل نو کے مسائل .... سعید النسا 69
● ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری .... ظہیر رحمتی ....
● قصہ شیر کا .... انتخاب احمد ....
● بابر کی اولاد (پلے) .... جاوید رحمانی ....
● اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857 .... سہیل انجم ....

بچوں کا گوشہ

● قدرت کا عجوبہ .... عبد العلیم قدوائی 76

آپ کی بات

■ ڈاکٹر رضوانہ ارم،صدر شعبۂ اردو، جمشید پور ویمنس کالج، جمشید پور

آپ کی جامع الکمالات شخصیت سے فیضیاب ہونے کا موقع آج کی ادبی محفل ''اردو — حال اور مستقبل'' میں میسر آیا۔ آپ کی پُر مغز اور معلومات سے پُر تقریر نے بے حد متاثر کیا۔ آپ نے چند منٹوں میں اردو ہندی تہذیب کو آئینہ کردیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے حوالے سے آپ کی خدمات ''اردو دنیا'' کی شکل میں نا قابلِ فراموش ہیں۔ ''زبان، ادب اور تعلیم'' کے حوالے سے تمام مضامین اہم ہوتے ہیں۔ اکتوبر کے شمارے میں گوشۂ احمد فراز کے تحت جو کچھ آپ نے شائع کیا ہے وہ ایک عظیم شاعر کو سچا خراجِ عقیدت ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی، کیریئر، تبصرہ و تعارف، بچوں کا گوشہ، وقت کے اہم تقاضوں کی جانب توجہ مبذول کراتے ہیں۔ آپ کے اداریے نے دو پڑوسی ملکوں کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ شہر آہن آپ کی علمیت و قابلیت سے بھرپور لکچر کے لیے ''ہمیشہ ممنون و مشکور رہے گا۔ اہل اردو، اردو کے خوش آئند مستقبل کے لیے ہمیشہ آپ سے پر امید رہیں گے۔

■ ڈاکٹر محمد ناظم علی، صدر شعبۂ اردو، گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد

''اردو دنیا'' کے مشمولات فکر انگیز اور معیاری ہوتے ہیں۔ کالم ''آپ کی بات'' تنقیدی وفکری بصیرت عطا کرتا ہے۔ اداریہ ''ہماری بات'' بھی فکر انگیز ہوتا ہے۔ ہندوستان برسوں سے امن کا گہوارہ رہا ہے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور رواداری ہندوستان کی اہم خصوصیات میں سے ہیں۔ اس ملک کی ترقی کا راز بقائے باہم میں ہے۔ یہ ملک ایک گلدستہ ہے اس کے ہر پھول کو پنپنے کا موقع دینا چاہیے، دستورِ ہند کا بھی یہی تقاضا ہے۔ اداریے میں آپ نے ان باتوں پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر بیگ احساس نے افسانے اور انشائیے کے فرق کو سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور افسانے اور انشائیے کے حدود کو ظاہر کردیا ہے۔ مضمون معلومات سے پُر ہے لیکن انشائیے کے تعلق سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ انشائیہ کے اجزائے ترکیبی آج تک متعین نہیں ہوسکے ہیں۔ اگر داستاں میں انشائیہ کی جڑیں تلاش کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے تو کیا افسانے میں انشائیہ نما جملے نہیں ملتے۔ بعض افسانے انشائیے کا رنگ لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ پروفیسر بیگ احساس کا مضمون ادبی معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ رالف رسل نے مغربی دنیا میں اردو کی جڑیں مضبوط کرنے کی کوشش کی اس شمارے میں ان کے کارناموں اور اردو کے لیے ان کی خدمات کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ اب مغرب میں اردو پڑھنے والے انگریز کم ملیں گے۔ حبیب تنویر اپنے ڈراموں کی وجہ سے ادب میں شہرت رکھتے ہیں۔ لیکن انھوں نے دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ بہرحال اس شمارے کے مختلف ذیلی کالموں کے تحت جو مشمولات شامل ہیں وہ ادب کے قاری کے علاوہ عام قاری کے لیے دل چسپی اور مفید معلومات کے حامل ہیں۔ ''اردو دنیا'' رسائل کی دنیا میں ایک منفرد رسالہ ہے جس میں ادب کے علاوہ مختلف علوم وفنون پر نگارشات پڑھنے کو ملتی ہیں۔ اردو طلبہ اس کو باقاعدہ پڑھیں تو وہ مسابقتی دنیا میں اپنا مقام بنا پائیں گے۔

■ پرنسپل، شمس العلوم، بی بی ہنکو اوایا بگہا، ضلع مغربی چمپارن، بہار

اردو کے لیے قومی اردو کونسل کی خدمات لائق صد احترام و قابل ستائش ہیں۔ جو خدمات آپ حضرات انجام دے رہے ہیں وہ آپ لوگوں کے حسن کارکردگی اور انتھک کاوشوں اور لگاتار محنت کا ثمرہ ہیں۔

■ محمد سراج عظیم، A-47، ذاکر باغ، اوکھلا روڈ، نئی دہلی-110025

میں ''اردو دنیا'' کا مستقل قاری ہوں۔ ''اردو دنیا'' محض روایتی انداز کا غزل، نظم، افسانہ، طنز ومزاح وغیرہ پر مشتمل جریدہ نہ ہوکر اپنے گرد وپیش اور پوری اردو دنیا میں رونما ہونے والے واقعات، تازہ ترین حالات نیز نئی جہات وامکانات سے روشناس کرانے والا مکمل جریدہ ہے۔ پچھلے ڈیڑھ دو سال سے جو ایک اہم اور نمایاں تبدیلی میں نے اس رسالے میں دیکھی ہے وہ ہے ''گوشۂ اطفال''۔ یہ آپ کی ادارت کا ہی سلیقہ ہے جو آپ نے اس ضرورت کو محسوس کیا۔ کسی بھی ادب کا بنیادی پہلو ''ادب اطفال'' ہے، اگر وہ نہیں ہوگا تو ادب نہیں ہوگا میرا ایسا نظریہ ہے۔ شاید غلط ہو لیکن بہرحال ادب اطفال کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ آپ اس احسن کاز کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ آپ سے گزارش کروں گا کہ برائے مہربانی اس سلسلے کو قائم رکھیں۔

■ شفیع رحمٰن اکولوی، اکولہ

''اردو دنیا'' برابر مل رہا ہے۔ دسمبر 2008 کا شمارہ نظر کے سامنے ہے۔ ''اردو خبرنامہ'' کالم کے تحت عنوان ''ہندوستان کی آزادی وتعمیر نو میں مولانا آزاد کا حصہ ناقابلِ فراموش'' میں صدر جمہوریہ محترمہ پرتیبھا پاٹل اور انسانی وسائل کے مرکزی وزیر جناب ارجن سنگھ نے مولانا آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

محترمہ پاٹل نے فرمایا ''مولانا آزاد نے فرقہ واریت کے خلاف بہت سخت موقف اپنایا اور سیکولر ہندوستان کی وکالت کی۔'' محترمہ مہاراشٹر ریاست سے متعلق ہیں۔ انھیں معلوم ہو کہ مہاراشٹر ریاست میں دسویں جماعت کی تاریخ کی کتاب کے باب ''ہندوستان کی قومی تحریک آزادی'' میں کسی مسلم مجاہدِ آزادی کا نام ہے نہ تذکرہ، مولانا آزاد کا بھی نہیں۔

مشاعروں کی رپورٹنگ کرتے ہوئے آپ بیچ بیچ میں اشعار شائع کرتے ہیں جو مزہ دیتے ہیں۔ یہ ایک اچھی روایت قائم کی آپ نے۔ جناب رفعت سروش کا خط دل کو تڑپا گیا۔ حسب معمول بھی مشمولات معیاری ہیں۔ □□□

ہماری بات

قومی اردو کونسل اردو کی ہمہ جہت ترقی کے لیے مسلسل کوشاں ہے اور اس کی کوششیں بارآور بھی ہورہی ہیں۔ اردو ہندوستان کی اہم قومی زبانوں میں شامل ہے۔ اس لیے بھی اس کے تحفظ اور ترقی کے لیے تمام ضروری اقدامات کیے جانے چاہئیں لیکن اس نے کثرت میں وحدت کے جس جذبے کو فروغ دیا ہے اس کی ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مختلف ثقافتی اور تہذیبی اکائیاں اپنے وجود کا اثبات چاہتی ہیں، غیر معمولی اہمیت ہے۔ اردو کا افسانوی ادب ہو یا شعری سرمایہ، انسانی اقدار کا احترام اور غیر انسانی رویّوں سے اجتناب اس کا نمایاں وصف ہے۔ یہ اردو زبان کی اہمیت اور افادیت کے وہ پہلو ہیں، جن سے لوگ باخبر تو ہیں لیکن وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اردو اپنے بولنے والوں اور پڑھنے لکھنے والوں کے لیے ان مادّی سہولتوں کے حصول میں بھی معاون ہو جو آج کی زندگی کا لازمی حصہ بن چکی ہیں مثلاً بہتر روزگار اور رہن سہن کا بہتر معیار۔ سچ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں صرف اردو ہی نہیں، ملک کی کوئی ایک زبان بھی تنہا اپنے طور پر بہتر روزگار کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بحالات موجودہ انگریزی کی تعلیم ضروری ہے۔ جس میں اردو کی تعلیم کہیں حارج نہیں ہوتی بلکہ انگریزی کی اچھی شد بد بھی وہ طلبہ زیادہ آسانی سے حاصل کرسکتے ہیں جن کی ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں ہوئی ہو۔ دنیا کے سبھی ماہرین تعلیم اس پر متفق ہیں کہ بچوں کی فطری صلاحیتوں کی درست سمت میں نشوونما کے لیے ان کی ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ لہٰذا اردو مادری زبان والے طلبہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم اردو میڈیم سے ہو اور وہ آگے چل کر بھی اردو سے اپنا رشتہ استوار رکھیں۔

اردو کونسل اردو کو یہ حیثیت دلانے کے لیے بھی کوشاں ہے کہ اردو سیکھ کر روزگار کے حصول میں طلبہ کو مدد مل سکے۔ اس کے لیے کونسل نے ملک بھر میں اردو کمپیوٹر سینٹر قائم کیے ہیں جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ اب تک ان سینٹروں سے ہزاروں طلبہ تربیت پاکر روزگار کے بہتر وسائل حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ زبان کی تعلیم صحیح خطوط پر ہو، اس کی ذمے داری اساتذہ پر عائد ہوتی ہے اور اس ذمے داری سے صحیح طور پر وہی اساتذہ عہدہ برآ ہوسکتے ہیں جو تعلیم و تعلم کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے خود کو باخبر رکھیں۔ اردو کونسل نے اس سمت میں بھی پیش رفت کی ہے اور وقتاً فوقتاً ایسے ورکشاپ منعقد کیے ہیں جن میں شریک ہوکر اساتذہ آپس میں تبادلۂ خیال کرسکیں، ایک دوسرے کے تجربات سے استفادہ کریں اور اس طرح اپنی کارکردگی کو بہتر بناسکیں۔

ایک اہم مسئلہ مختلف سطحوں پر اردو نصابات میں یکسانیت لانے کا ہے۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ مختلف اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جہاں اردو تدریس کا نظم ہے، اردو کے الگ الگ نصابات پڑھائے جارہے ہیں جس سے طلبہ اکثر ذہنی پراگندگی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اس مسئلے پر غوروخوض کرنے اور ایک ایسا نصاب وضع کرنے کے لیے جو ہر جگہ پڑھایا جاسکے، پچھلے دنوں دلی میں کونسل نے ایک سہ روزہ ورکشاپ کا انعقاد کیا۔ اس ورکشاپ کی تفصیل آپ خبرنامے میں ملاحظہ کرسکیں گے۔ ورکشاپ کے اختتامی اجلاس میں اردو کونسل کے فعّال ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ ہمیں سرٹیفکیٹ، ڈپلوما، ایڈوانس ڈپلوما، بی اے اور ایم اے کے ایسے نصابات کا خاکہ تیار کرنا ہے جس سے اردو نصاب میں 80 فیصد یکسانیت لائی جاسکے۔ انھوں نے کہا کہ 20 فیصد نصاب کی تیاری مقامی ذمے داروں کو سونپ دینی چاہیے کہ وہ اپنے اپنے علاقائی ادب کا مطالعہ اس کے تحت کرسکیں۔

سہ روزہ ورکشاپ کے آخری دن نصابات کا جو خاکہ تیار ہوا ہے وہ کونسل یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو سونپ دے گی اور کمیشن سے درخواست کرے گی کہ تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس کو نافذ کیا جائے۔ کونسل کا منصوبہ یہ بھی ہے کہ خاکے میں نشانزد کیے گئے مواد کو مرتب کرکے کتابی شکل میں بھی شائع کیا جائے تاکہ نصابی مواد کی فراہمی طلبہ کے لیے آسان ہوجائے اور وہ اس ذہنی خلجان سے بچ سکیں جو نصابی کتابوں کی بروقت فراہمی نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ اس سلسلے کی دوسری ورکشاپ تھی، پہلی ورکشاپ کچھ مہینے پہلے منعقد کی گئی تھی اور اس میں جو سفارشات پیش کی گئی تھیں، دوسری ورکشاپ میں انھیں بھی پیش نظر رکھا گیا۔

قومی اردو کونسل اردو کی توسیع و ترقی کے لیے جو کوششیں کررہی ہے، ان کی کامیابی کا انحصار پوری اردو دنیا کے سرگرم تعاون پر ہے۔ یہ تعاون ہمیں حاصل بھی ہے مگر ہم اس میں اور اضافے کے متمنی ہیں۔

•

پچھلے دنوں اردو کے دو اہم شاعر ہمارے درمیان سے اٹھ گئے رفعت سروش جو ترقی پسند تحریک کے آغاز کے زمانے میں سامنے آئے تھے اور جنھوں نے اس تحریک کے زیرسایہ ہی اپنے ذہنی سفر کی منزلیں طے کیں اور عادل منصوری جو جدیدیت کے رجحان کے آغاز کے ساتھ اپنے انفرادی رنگ و آہنگ کے ساتھ نمایاں ہوئے۔ ہم آئندہ شمارے میں ان دونوں کے فکروفن پر مضامین شائع کریں گے۔

□□□

تحریر: مارکنڈے کاٹجو
ترجمہ: امتیاز وحید

ہندوستان میں اردو کے ساتھ ناانصافی

ہمارے ملک میں اردو کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ یہ عظیم زبان جس نے غالباً جدید ہندوستان میں بہترین شاعری کی تخلیق کی۔ میر، غالب، فراق، فیض وغیرہ اور جو ہندوستانی ثقافت کے خزانے کا درخشاں موتی ہے، آج نظرانداز کردی گئی ہے اور تقریباً اسے شبہ کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے، میں اس سے بڑی حماقت تصور نہیں کرسکتا۔

اردو کے ساتھ اس ناانصافی کے دو غلط نقطۂ نظر تھے جو چند وقتی مفاد پرستوں کے ذریعے پھیلائے گئے تھے کہ (1) اردو ایک بدیسی زبان ہے (2) اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔

پہلا نقطۂ نظر بے بنیاد ہے، عربی اور فارسی بلاشبہ غیرملکی زبانیں ہیں لیکن اردو پوری طرح ملکی ہے یہ یہیں بازار اور لشکر کی زبان کی حیثیت سے ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ اپنی سادہ ہیئت (کھڑی بولی یا ہندوستانی) میں یہ ہندوستانی شہروں کے بڑے حصوں میں ایک عام آدمی کی زبان ہے۔

اس کی قابل ذکر ہستیاں بھی ہندوستان میں رہتی ہیں اور انھوں نے ہمارے کلچر میں غیرمعمولی اضافہ کیا ہے، عوام کے مسائل میں ہاتھ بٹایا ہے، ان کے غم میں ہمدردی اور ان کے دلوں کو چھوا ہے۔ صرف انجان لوگ ہی اردو کو ایک غیرملکی زبان کہہ سکتے ہیں۔

دوسرا خیال یہ کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، یہ بھی غلط ہے، حقیقت یہ ہے کہ پچھلی نسل تک ہمارے ملک میں اردو ہندوستان کے بیشتر شہری حصوں میں پڑھے لکھے طبقے کی زبان تھی خواہ وہ ہندو، مسلم، سکھ یا عیسائی کیوں نہ ہو۔

میرا خیال ہے کہ کوئی ملک اپنے ثقافتی ورثے کو نظرانداز کرکے ترقی نہیں کرسکتا اور میں یہ واضح کرتا چلوں کہ صرف کشمیری پنڈت ہی میرے اکابروں میں سے نہیں ہیں بلکہ اپنے پیش روؤں کی حیثیت سے میں کالی داس اور امیر خسرو کا بھی احترام کرتا ہوں، اشوک، اکبر، سورداس اور تلسی داس کی طرح میرے اکابرین میں میر اور غالب بھی میرے محترم ہیں۔ حقیقی وراثت ثقافتی وراثت ہے نہ کہ محض خونی وراثت۔

ہمارے ملک میں اردو نے درج فہرست قومی زبان کی حیثیت اختیار کرلی ہے جیسا کہ یہ ملک کی تیرہ ریاستوں میں بولی جاتی ہے۔ اس طرح سے اردو ایک ایسی زبان ہے جو دو زبانوں فارسی اور ہندوستانی کے امتزاج سے بنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے میں اسے ریختہ یعنی ملی جلی کہا جاتا تھا۔

چوں کہ اردو، فارسی اور ہندوستانی سے مل کر بنی ہے لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اردو، فارسی کی کوئی مخصوص قسم ہے یا ہندوستانی کی کوئی خاص قسم ہے، جواب یہ ہے کہ یہ فارسی کی کوئی مخصوص قسم نہیں بلکہ ہندوستانی کی ایک مخصوص قسم ہے۔

میں اس پر اس لیے زور دے رہا ہوں کہ اگر اردو فارسی کی کوئی مخصوص قسم ہوتی تو یہ غیرملکی زبان ہوتی۔ یہ حقیقت کہ یہ کھڑی بولی (یا ہندوستانی) کی ایک مخصوص قسم ہے جو بتاتی ہے کہ یہ ایک دیسی یا ملکی زبان ہے۔

کھڑی بولی یا بول چال کی ہندی ادبی ہندی کی بہ نسبت آسان ہے جس کا استعمال بہت سارے اہل قلم اور عام بولنے والے کرتے ہیں۔

یہ ان جگہوں کے عام انسان کی پہلی زبان ہے جسے ہندی بولنے والے علاقے (اترپردیش، بہار، راجستھان، مدھیہ پردیش، دہلی، ہریانہ، ہماچل پردیش وغیرہ) کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اور یہ بہت سے غیر ہندی والے علاقے میں دوسری زبان ہے، نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پاکستان میں بھی۔

صدیوں تک فارسی، ہندوستانی عدلیہ کی زبان رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فارسی نے ثقافت، شان وشوکت اور تصنع کی زبان کی حیثیت سے فردوسی، حافظ، سعدی، رومی، عمرخیام جیسے اہل قلم کے ذریعے پروان چڑھی ہے اور اس طرح یہ مشرقی دنیا کے بڑے حصے میں پھیلی ہے۔

مغل اصل فارس نہیں بلکہ ترک تھے۔ ان کی زبان گرچہ ترکی تھی پھر بھی انھوں نے فارسی کو عدلیہ کی زبان کی حیثیت سے قبول کرلیا کیوں کہ فارسی ترکی سے زیادہ ترقی یافتہ زبان تھی۔ یہاں تک کہ بابر نے گرچہ اپنی خودنوشت ''تزک بابری'' ترکی میں لکھی لیکن اس کے پوتے اکبر نے اسے فارسی میں ترجمہ کروایا اور اسے 'بابرنامہ' سے موسوم کیا۔

خود اس کی سوانح عمری 'اکبرنامہ' جسے ابوالفضل نے لکھی، فارسی زبان میں ہے، اسی طرح اس کے بیٹے جہانگیر کی خودنوشت (موسوم بہ 'جہانگیرنامہ') اور شاہ جہاں کی سوانح عمری (معروف بہ 'شاہ جہاں نامہ') بھی۔

کئی صدی تک فارسی ہندوستانی عدلیہ کی زبان تھی اور اس طرح اس زبان کا اثر شہروں کی عام زبانوں پر بھی پڑا ہے جس کا تذکرہ پہلے ہی 'کھڑی بولی' کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔

تاہم اردو زبان کس طرح معرض وجود میں آئی؟ یہ بڑا دلچسپ سوال ہے اور میں اس کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

بعد کے مغل صرف نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ درحقیقت یہ کنگال ہو چکے تھے۔ وہ برطانویوں، مراٹھوں اور اپنے ان گورنروں کے ہاتھوں اپنا اقتدار کھو چکے تھے جو پہلے ہی خود مختار حکمراں ہو چکے تھے (مثلاً اودھ اور حیدرآباد کے نواب) ان کے دور حکومت میں عدلیہ کی زبان فارسی بتدریج ختم ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ اردو نے لے لی۔

آخر کیا وجہ ہے کہ عدلیہ کی زبان جو عظیم مغلوں کے دور حکومت میں فارسی تھی بعد کے مغلوں کے دور میں اردو ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ رہی ہے کہ بعد کے مغل حقیقی حکمراں نہیں رہے بلکہ وہ تمام سہولتوں سے تقریباً تہی دست یا عام لوگوں، محتاجوں کی طرح تمام طرح کی پریشانیوں میں گھر چکے تھے۔ بالآخر انھیں اس زبان کی طرف رجوع کرنا پڑا جو عوام انسان سے قریب تھی۔

آخر 'کھڑی بولی' عدلیہ کی زبان کیوں نہیں بن سکی جو کہ شہروں میں عوام کی زبان تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بعد کے مغل اور ان کے افسران، نواب اور وزرا کنگال ہو جانے کے باوجود اپنے وقار، کلچر اور خودداری کو پھر سے بحال کرنا چاہتے تھے۔ انھیں ابھی بھی شہزادہ تیموریہ یعنی وارثین تیمور — عظیم فاتح (جو بابر کا پردادا تھا) اور عالی مغل کی نسل سے تھا، ہونے کا فخر تھا۔

اردو کے مشہور شاعر غالب کی مشہور کہانی ہے کہ زبردست معاشی تنگی میں ہونے کے باوجود انھوں نے ملازمت سے صرف اس لیے انکار کردیا کیوں کہ جب وہ اپنی خدمات پیش کرنے گئے تو کوئی ان کے خیر مقدم کے لیے وہاں موجود نہیں تھا۔

مضمون اردو یعنی احساسات اور اس میں ظاہر ہونے والے خیالات عام آدمی کے ہیں مگر اس کے اظہار کا طریقہ پُر تکلف ہے، دوسرے لفظوں میں، اردو عوام کے مسائل، غم، بے چینی، امید اور حوصلے کا اظہار کرتی ہے لیکن اس کا اسلوب (انداز بیان) عام آدمی کا نہیں ہوتا بلکہ بناوٹی یا تصنع آمیز ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر غالب نے اپنی شاعری میں ایک عوامی جگہ کے خوف و دہشت کا اظہار کیا ہے۔ اپنی احساس برتری کے پیش نظر اسے عوام الناس سے مختلف ہونے کا شدید احساس ہے۔

غالب کا پختہ خیال تھا کہ شاعری کی زبان بول چال کی زبان کی طرح نہیں ہونی چاہیے، لہٰذا وہ اکثر اپنے خیالات کا اظہار بلا واسطہ نہیں بلکہ بالواسطہ اشاروں، کنایوں اور مبہم انداز میں کرتے ہیں۔

اردو کے دوسرے بہت سے شعرا کی صورت حال بھی یہی ہے۔ وہ اکثر اپنے خیالات و احساسات کا اظہار سادہ، بلاواسطہ زبان میں نہیں کرتے بلکہ چوٹ کرنے کے انداز میں، اشاروں، کنایوں اور مبہم انداز میں کرتے ہیں، مقصد عوامی ہونے کے بجائے وضعدار اور اعلیٰ ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ تاہم بسا اوقات یہ چیزوں کی تفہیم میں دشواری پیدا کرتی ہے۔ (عظیم اردو ناقد اور سوانح نگار حالی نے غالب کی ایک تہائی شاعری کو اردو میں ہونے کے باوجود بہت مغلق اور مشکل بتایا ہے) اور بعض اوقات ان اشعار سے مختلف معانی و مطالب وابستہ کیے جاسکتے ہیں۔

ہندوستان میں جب تک طاقتور مغل بادشاہ رہے، فارسی عدلیہ کی زبان تھی اور اردو کو کبھی بھی وقعت نہیں دی گئی اور یہ شمالی ہند میں کبھی بھی عدالت کی زبان نہیں بن سکی البتہ اس نے اپنی محفوظ جگہ اور جائے پناہ جنوبی ہند اور گجرات میں حاصل کرلی (جہاں یہ طبقۂ اشرافیہ کی زبان تھی)۔

ایک معنی میں اردو کی ابتدا جنوبی ہندوستان میں ہوئی اور عظیم مغلوں کے دور حکومت میں وہاں مقبولیت حاصل کی۔ اسے جنوبی ریاست گولکنڈہ، بیجاپور، احمد نگر وغیرہ کی سرپرستی بھی حاصل رہی جہاں یہ عدلیہ کی زبان بن گئی۔

لہٰذا یہ ذکر کرنا دلچسپ ہے کہ مغلوں کے دور اقتدار میں اردو جنوبی ہند اور گجرات میں عدالت کی زبان بن گئی لیکن شمالی ہندوستان میں جب تک مغل طاقتور رہے یہ کبھی بھی فارسی کی جگہ نہیں لے پائی۔

یہ صرف اس وقت ہوا جب بعد کے مغلوں کا دور شروع ہوا (1707 میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد) کہ اردو عدالت کی زبان کی حیثیت سے رفتہ رفتہ فارسی کی جگہ لینے لگی گرچہ یہ کام بڑی بے دلی سے انجام پایا۔ اس کی مثال غالب ہیں جنھوں نے اپنی فارسی شاعری کو ترجیح دی اور اپنی اردو/شاعری کو ہیچ نظر سے دیکھا (اگرچہ ان کی عظمت کلیتہً اردو شاعری کی وجہ سے ہے)۔

اسی طرح ایک خط میں غالب اپنے دوست شوذین آرام کو لکھتے ہیں ''میرے دوست!'' میں اردو میں کیسے لکھوں؟ کیا میرا معیار اتنا پست ہے کہ مجھ سے ایسی توقع کی جاتی ہے؟ اس طرح اردو میں لکھنا خلاف شان سمجھا جاتا تھا اور اس وقت کے تمام قابل قدر اہل قلم نے فارسی میں لکھا ہے۔

ہندوستانی شہر کے بڑے حصوں میں عام آدمی کی زبان ہونے کے ناطے اردو تمام زبان سے ماخوذ ہے اور یہ کبھی بھی دوسری زبانوں کے الفاظ پر معترض نہیں ہوئی۔ چونکہ اردو عوام کی زبان تھی لہٰذا عوام نے اس سے محبت کی اور یہ آج بھی محبوب ہے۔

آج بھی ہندی فلمی نغمے اردو میں ہوتے ہیں کیوں کہ دلی آواز کا اظہار اپنی زبان ہی میں ممکن ہے۔ تاہم کچھ لوگ اسے ختم کرنے کی پرزور کوشش کر سکتے ہیں۔

ریلوے بک اسٹال میں جو کتابیں فروخت ہوتی ہیں وہ غالب، میر،

فیض، جوش، فراق، حالی، داغ، مجاز، ذوق وغیرہ کی ہوتی ہیں (آج کل دیوناگری رسم الخط میں دستیاب ہیں) اور ہندی شعرا کی نہیں ہوتی ہیں۔

ہندی کے وہ اہل قلم جو اردو پس منظر رکھتے ہیں جیسے پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور مالک رام وغیرہ ہندی کی دنیا میں بھی قابل قبول ہیں۔

اردو ہندوستانی عوام میں محبوب ہے کیوں کہ یہ عوام کے بیچ میں پلی بڑھی ہے، اردو ادب احتجاجی ادب ہے، احتجاج عام انسان کے دکھ اور درد کے خلاف اور ناانصافی کے خلاف۔

اردو شاعری نے رسوم پرستی اور ظالمانہ یا فرسودہ سماجی ریت ورواج کے خلاف آواز اٹھائی ہے (اس معنی میں اسے کبیر کی شاعری کا جانشیں کہا جاسکتا ہے گرچہ حقیقت میں یہ کہیں زیادہ پرتکلف ہے)۔

جدید ہندوستان میں عوام کی زبان ہونے کے ناطے لوگ اردو سیکھ رہے ہیں، سوائے اقبال کے آخری دور کی شاعری کے جب وہ 'وطن پرستی' چھوڑ کر 'اتحاد اسلامی' کی طرف چلے گئے۔

اردو ادب پر صوفیوں کا اثر ہے، صوفیا مسلمانوں میں رواداری تھے، متعصب نہیں تھے، انھوں نے مذہب اور ذات وغیرہ کی تفریق کے بغیر تمام انسانوں میں آفاقی پیغام محبت کو عام کیا۔

اردو کے بعض قلمکاروں نے ہولی، دیوالی، راکھی اور دیگر ہندو تہواروں اور رسموں پر بڑی خوبصورت نظمیں لکھی ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کسی مخصوص مذہب کی زبان نہیں ہے۔ ہندوؤں کی ایک تعداد اردو ادب کے صفِ اوّل میں اپنا نام درج کرا چکی ہے مثال کے طور پر فراق، چکبست، رتن ناتھ سرشار وغیرہ۔ دلی کی شاعری میں گنگا، جمنا، کرشنا، رام، سرسوتی، سیتا، لکشمی وغیرہ الفاظ کثرت سے نظر آتے ہیں۔

1947 میں تقسیم ہند سے اردو کو زبردست نقصان پہنچا، تب سے ہندوستان میں اردو پر ایک غیر ملکی زبان اور صرف مسلمانوں کی زبان ہونے کا ایسا داغ لگا کہ خود مسلمانوں نے اپنی حب الوطنی اور ہندو بھائیوں سے اتحاد ظاہر کرنے کے لیے اردو پڑھنا چھوڑ دیا۔

نفرت کی وجہ سے ان فارسی الفاظ کو ہٹا کر جو عمومیت سے کھڑی بولی میں مستعمل تھے اور انھیں ان سنسکرت الفاظ سے جو عام استعمال میں نہیں ہیں، تبدیل کرنے کا منصوبہ غیر ضروری طور پر ہندی کی سنسکرت سازی کی صورت میں منتج ہوا ہے، جس کا سمجھنا عام آدمی کے لیے اکثر دشوار ہوتا ہے۔

تاہم تمام معاندانہ کوششوں کے باوجود وہ زبان جو دلی آواز کی ترجمانی کرتی ہے، جب تک لوگوں کے پاس دل ہے کبھی بھی بزور قوت مٹائی نہیں جاسکتی۔ اس کا ثبوت کہ اردو ہندوستانیوں کے دل میں زندہ ہے۔ سماج کے ہر طبقے اور ملک کے تمام حصوں شمال، مغرب، جنوب اور مشرق سے مشاعرے کی طرف کھنچ کر آنے والی جم غفیر کی صورت میں آج بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر اردو ایک بدیسی زبان ہے تو بڑی تعجب کی بات ہے کہ ہندوستانی عوام اسے اس قدر چاہتی ہے۔

میں یہ بتاتا چلوں کہ سنسکرت کے بارے میں ایک غلط فہمی ہے کہ یہ ہندو مذہب کی زبان ہے (ٹھیک جس طرح یہ غلط فہمی ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے)۔ دراصل سنسکرت آزاد خیال لوگوں کی زبان ہے۔ سنسکرت میں فلسفیانہ مکاتب فکر کی در چونکا دینے والی ہے۔ خالص مذہبیت سے کامل دہریت کی طرف۔

ہندی کے بڑے قلمکار سنسکرتا تائن کا کہنا ہے کہ سنسکرت سیکھنے سے قبل وہ خدا میں یقین رکھتا تھا لیکن سنسکرت سیکھنے کے بعد وہ دہریہ بن گیا۔

قدیم ہندوستان کے بڑے سائنس داں آریہ بھٹ، سشرت اور چارک سبھی نے سنسکرت میں لکھا اور اسی طرح فلسفیوں، نجومیوں، ڈراما نگاروں اور شاعروں نے بھی کیا ہے۔

اردو کی ترقی کے لیے کوشش کرنے والوں کو چاہیے کہ اردو کو سنسکرت سے جوڑیں اور اسے تنہا نہ چھوڑیں، اس طریقے سے اردو فرقہ وارانہ زبان کی حیثیت سے داغدار نہیں ہوگی۔

میرا یہ مشورہ بھی ہے کہ اردو شعرا کے کلام کی اشاعت میں دیوناگری رسم الخط کا بھی استعمال ہونا چاہیے۔ (جیسا کہ پرکاش پنڈت نے کیا ہے) یہ ان لوگوں کی معاونت کرے گا جو اسے پڑھنے کے لیے فارسی رسم الخط سے ناواقف ہیں۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ صفحہ کے بائیں جانب متن فارسی رسم الخط میں چھپے جبکہ صفحہ کی دائیں جانب یہ دیوناگری رسم الخط میں شائع ہو ساتھ ہی نیچے آسان ہندی (ہندوستانی) میں مشکل الفاظ کے معنی واضح کردیے جائیں۔

اخیر میں، میں اردو اور ہندی کے قلمکاروں سے اپیل کرنا چاہوں گا کہ وہ آسان زبان کا استعمال کریں۔ اکثر ہندی یا اردو چیزیں پڑھتے وقت قاری کو اس کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن تحریر شدہ چیزیں اگر ناقابل فہم ہیں تو ایسا ادب کس کام کا؟ آج ہندوستانی عوام کو غربت، بے روزگاری، مہنگائی وغیرہ جیسے خوفناک مسائل کا سامنا ہے۔

ادب کو ان مسائل کے محاذ پر عوامی جدوجہد میں ضرور ہاتھ بٹانا چاہیے اور یہ کام آسان زبان کے استعمال سے کیا جاسکتا ہے جسے لوگ بہ آسانی سمجھ سکیں مثال کے طور پر جنگ کے وقت ونسٹن چرچل کی تقاریر یا پریم چند اور سرت چندر کی کہانیاں۔

□□□

پتہ:
101-E, Mahanadi Hostel, JNU, New Delhi-110067

مجتبیٰ حسین

اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

امریکہ میں تین مہینوں کے طویل قیام کے بعد پچھلے دنوں میں حیدرآباد واپس ہوا تو میرے برادرعزیز، برادرعزیز، عزیز پاشا، رکن پارلیمنٹ نے میرے ایک اور برادرعزیز شمیم فیضی کی خواہش کے حوالے سے اطلاع دی کہ مجھے اردو کے ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس میں شرکت کی خاطر اعظم گڑھ چلنا ہوگا۔ میرے یہ دونوں برادرانِ عزیز میری ایسی متاعِ عزیز ہیں، جن کی خواہش پر میں کہیں بھی جاسکتا ہوں۔

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

چنانچہ اعظم گڑھ جانے کے ارادے سے دو دن پہلے میں دہلی آیا تو میرے ایک اور برادرعزیز ڈاکٹر علی جاوید نے اطلاع دی کہ مجھ ناچیز کو اس کانفرنس کا افتتاح بھی کرنا ہے۔

عزیزانِ گرامی! جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں اردو کا ایک ادنیٰ مزاح نگار ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے برادرانِ عزیز میرے ساتھ عملی مذاق کرنے کی گنجائش نکال کر مجھے بالآخر آزمائش میں مبتلا کردیں۔ جس شہرہ آفاق انجمن کی ایک طویل اور عظیم الشان تاریخ رہی ہو اور جس سے اردو ادب کی کئی جلیل القدر ہستیاں وابستہ رہی ہوں وہاں مجھ جیسے کم سواد اور کم مایہ مزاح نگار کا کیا کام۔ مجھے اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا پوری طرح احساس ہے۔ ویسی بلندی اور ایسی پستی آپ نے کہیں نہیں دیکھی ہوگی۔

تاہم یہ ایک اتفاق ہے کہ ترقی پسند تحریک کے آغاز اور اس خاکسار کی پیدائش کا سن ایک ہی ہے اور یوں ہم دونوں نے تقریباً ساتھ ساتھ ہی اس دنیا میں آنکھیں کھولیں۔ بس ذرا سا ترقی پسند تحریک عمر میں مجھ سے تین مہینے بڑی ہے تو کیا ہوا۔ تاہم اس سے میرا تعلق وہی ہے جو چولی اور جوبن کا ہوسکتا ہے۔ سجاد ظہیر، ملک راج آنند، فیض احمد فیض، آنند نرائن مُلّا، رشید جہاں، ڈاکٹر عبدالعلیم اور محمود الظفر وغیرہ۔ یہ وہ اکابرین ادب تھے جو رہتے تو محلوں میں تھے مگر جنھوں نے حالات کے فوری تقاضے کے طور پر جھونپڑیوں کے خواب دیکھنے کو ضروری سمجھا تھا۔ ملک کے ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس جو 1936 میں لکھنؤ میں منعقد ہوئی تھی وہ ہمہ لسانی تھی اور اس کی صدارت منشی پریم چند نے کی تھی۔ آج کے نامساعد حالات میں اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی موجودہ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے مجھے اس آٹھ روزہ کانفرنس کی یاد آرہی ہے جو خالصتاً اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کل ہند کانفرنس تھی جو اکتوبر 1945 میں حیدرآباد میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کے معتمد عمومی میرے بزرگ اور کرم فرما عابد علی خاں تھے اور اس کے جملہ انتظامی امور کے نگران میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر تھے۔ افسوس کہ یہ دونوں بزرگ اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ کرشن چندر نے اس کانفرنس پر مبنی اردو زبان کا جو پہلا رپورتاژ لکھا تھا اس کے ہیرو محبوب حسین جگر ہی تھے۔ میرے دوسرے بڑے بھائی مشہور طنز نگار ابراہیم جلیس بھی اس کانفرنس کے سرگرم کارکن تھے۔ اس بات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک سے میرے اور میرے خاندان کے مراسم کتنے گہرے رہے ہیں۔ حیدرآباد کے جاگیردارانہ ماحول میں اس کانفرنس کا انعقاد خاموش سطحِ آب پر کنکری پھینکنے کے مترادف تھا جس کے باعث یوں لگے کہ سطح آب پر سونامی کی لہریں سی دوڑ گئی تھیں۔

صبح کو داڑھی بناتے وقت کبھی کبھی میری نظریں خود اپنی آنکھوں پر پڑ جاتی ہیں تو انھیں دیکھ کر مجھے ان آنکھ پر رشک بھی آتا ہے اور ترس بھی۔ رشک اس بات پر کہ ان معصوم آنکھوں نے، جو کبھی کمسن بھی ہوا کرتی تھیں، مخدوم محی الدین اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ جیسے انقلابی رہنماؤں کو تلنگانہ کی مسلح جدوجہد کے زمانے میں بھیس بدل کر روپوشی کی حالت میں دیکھا ہے، پھر ان آنکھوں نے ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ دیکھا ہے۔ سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، کتنے نام گناؤں جن کی دلنواز شفقتیں مجھے حاصل رہیں۔ ان آنکھوں پر رشک نہ آئے تو پھر کیا آئے۔ مخدوم کا ''سرخ سویرا'' مجھے زبانی یاد تھا۔ مخدوم، فیض، کرشن چندر، سردار جعفری اور سجاد ظہیر کی تحریروں کا مجھ پر اتنا اثر تھا کہ ہر صبح بستر سے جاگتے ہی میری پُرامید نگاہیں آسمان کی طرف بے ساختہ اٹھ جاتی تھیں کہ کہیں سرخ سویرا تو نہیں آیا۔ سرخ سویرا تو خیر نہ آیا البتہ علی الصباح بیدار ہونے کی عادت ضرور پڑ گئی۔ مجھے یاد ہے کہ ساٹھ کی دہائی میں میں نے حیدرآباد میں سجاد ظہیر کو ایک جلسہ میں پہلی بار دیکھا تھا انھیں جب اسٹیج پر بلایا گیا تو جس آہستہ روی اور سبک خرامی کے ساتھ وہ شہ نشین کی طرف بڑھنے لگے تو مجھے اس وقت احساس ہوا کہ اس ملک میں انقلاب کے آنے میں دیر کیوں ہو رہی ہے۔

یہ تو ہوئی اپنی ہی ان آنکھوں پر رشک آنے کی بات جنھوں نے اپنے وقت کی کئی جلیل القدر اور نابغۂ روزگار ہستیوں کو دیکھا ہے مگر ان ہی آنکھوں پر مجھے بسا اوقات ترس بھی آتا ہے۔ اس لیے کہ ان آنکھوں نے دوسری جنگ عظیم میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے ایٹم بموں کو ہولناکیوں کو دیکھا۔ پھر یوروپ اور مشرق بعید کو برسوں دوسری جنگ عظیم کے دوران آگ کے شعلوں

میں جلتے ہوئے دیکھا۔ جہاں آزادی کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھا وہیں ملک کی تقسیم کے نتیجے میں ہونے والے فسادات کی ہلاکت خیزیوں اور بربادیوں کو دیکھا۔ اپنے رشتے داروں کو اپنی ہی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ ویت نام، فلسطین، افغانستان، عراق اور دنیا کے کئی پسماندہ ممالک میں سامراجی طاقتوں کی جانب سے ڈھائے جانے والے بدترین مظالم کو دیکھا۔ سازشوں میں گھرے ہوئے سوویت نظام کو تاش کے پتوں کی طرح بکھرتے ہوئے دیکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ بیسویں صدی جیسی ظالم اور پرآشوب صدی کو دیکھنے کے لیے ایک نارمل انسان کے چہرے پر لگی ہوئی یہ دو آنکھیں یقیناً ناکافی تھیں مگر پھر بھی میری ان دو آنکھوں نے چپ چاپ دیکھنے کے اس عذاب کو سہہ تو لیا لیکن اپنے آپ ہی ان کے بند ہو جانے یا پتھرا جانے کو گوارا نہ کیا۔ بتایئے ایسی آنکھوں پر ترس نہ آئے تو پھر کیا آئے، بیسویں صدی سے نکل کر اکیسویں صدی میں داخل ہو جانے کے بعد اب یہی آنکھیں قومی اور بین الاقوامی سطح پر فرقہ پرستی، ظلمت پسندی، شدید عصبیت، تنگ نظری کے علاوہ دل ہلا دینے والی دہشت گردی کے وحشتناک مناظر کو دیکھتی چلی جارہی ہیں۔ سامراج نے اکیسویں صدی میں داخل ہو جانے کے بعد اب اپنا چہرہ اور حلیہ تبدیل کرلیا ہے۔ اس کے خطرناک عزائم نے کئی پُرفریب حیلوں، بہانوں اور ہتھکنڈوں کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ کہنے کو دنیا کے سارے براعظم اب سمٹ کر ایک ''گلوبل ولیج'' میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ اس عالمی گاؤں میں بھلے ہی سارے وشال براعظم سمٹ گئے ہوں لیکن ایک انسان سے دوسرے انسان کے بیچ جو فاصلہ روز بہ روز بڑھتا چلا جارہا ہے اسے ناپنے کے لیے سارے براعظموں کی لمبائی بھی ناکافی ہے۔ پھر مشکل یہ ہے کہ اس عالمی گاؤں پر اب ایک ہی طاقت کی بالادستی قائم ہوگئی ہے۔ کنزیومرازم (Consumerism) نے اس عالمی گاؤں میں اشیائے تعیش کی قیمت تو ضرور بڑھادی ہے لیکن انسان کی قیمت دن بہ دن گھٹتی چلی جارہی ہے۔ عزیزانِ گرامی! انسان کبھی بھی اتنا ارزاں نہیں ہوا تھا جتنا کہ آج کے دور میں ہو چکا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے ہمیشہ ظالموں کے خلاف مظلوموں کی حمایت میں جابروں کے خلاف مجبوروں کی حمایت میں، طاقتور کے خلاف کمزوروں کے حق میں، اندھیروں کے خلاف اجالوں کی حمایت میں، حاکموں کے خلاف محکوموں کی حمایت میں آواز بلند کی ہے اور اس آواز نے انسانی معاشرے کو ایک نئی سوچ، نیا زاویۂ نگاہ اور انسان دوستی کا ایک نیا درس دیا ہے۔ آج اسی آواز کو بین الاقوامی پس منظر میں زیادہ مستحکم، زیادہ واضح، باوقار، توانا اور حوصلہ مند بنانے کی ضرورت ہے تاکہ اس دھرتی پر پھر سے انسان دوستی کی بالادستی قائم ہو سکے مانا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور مسابقت کی اندھی دوڑ نے ادب، آرٹ اور کلچر کی معنویت اور اہمیت کو گھٹا دیا ہے جس کے باعث انسانی اقدار، اخلاقی پاسداریاں، روحانی سرخوشیاں اور بحیثیت فرد خود انسان کی بالادستی پس پشت چلی گئی ہے۔ کیا ہم اپنی توانائیاں، مشینوں کی مدد سے اشیائے صرف کو بنانے کی بجائے آدمی کو انسان بنانے پر صرف نہیں کر سکتے؟ انسانی جذبوں کا کاروبار کرنے والے یا سروکار رکھنے والے قبیلے کے ایک ادنیٰ فرد کی حیثیت سے میں اپنے فنکار اور ادیب دوستوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہم انسان اور اس کی انسانیت کو اس کا وہ کھویا ہوا مقام پھر سے عطا نہیں کر سکتے جسے صدیوں کے جان لیوا ریاض اور جدوجہد کے بعد ہمارے بزرگ دانشوروں، فنکاروں اور ارباب علم وفن نے حاصل کیا تھا؟ کیا ہم پھر سے انسان کو اس کائنات کا مرکز نگاہ نہیں بنا سکتے؟ کیا یہ دنیا پھر سے انسانیت اور سچائی کے محور کے اطراف نہیں گھوم سکتی؟ آج کے حالات میں ادب اور آرٹ ہی ایک ایسی مشین یا آلہ ہے جس کی مدد سے انسانوں کو ڈھالا جاسکتا ہے اور یہ کام ترقی پسند ادیب ہی انجام دے سکتے ہیں۔

مشکل یہ ہے کہ ایک مزاح نگار جب کوئی سنجیدہ بات کرتا ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے حالانکہ میری نظر میں طنز ومزاح نگار ہی سچا اور اچھا ترقی پسند ادیب ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی نظر ہمیشہ زمانے اور سماج کی ناہمواریوں، ناگواریوں، ناآسودگیوں، بے اعتدالیوں اور بوالعجبیوں پر جاتی ہے۔ کسی دانشور کا قول ہے کہ طنز کے تیر ونشتر سے اگر سماج کی اصلاح ہو سکتی تو بارود کو ایجاد کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ماضی کے بڑے طنز ومزاح نگاروں نے طنز اور برجستہ مزاح کی مدد سے ناہمواریوں کو ہموار، ناگواریوں کو گوارا، ناآسودگیوں کو آسودگی اور بے اعتدالیوں کو معتدل بنانے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ اردو کے ایک ادنیٰ مزاح نگار کی حیثیت سے میرا یہ راسخ العقیدہ ہے کہ جب تک اس دھرتی پر رہنے والے ہر انسان کو اس کے حصے کی سچی خوشیاں اور مسرتیں نہیں مل جاتیں تب تک اس دھرتی پر دائمی امن قائم نہیں ہو سکتا، عالمی سطح پر مسرتوں کی مساویہ تقسیم ہی ایک ترقی پسند ادیب کا بنیادی مسلک اور نصب العین ہونا چاہیے۔

مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ 1995 کے بعد سے اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی کوئی کانفرنس منعقد نہ ہو سکی۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اردو کے ادیب اور فنکار جو ترقی پسندی کی ایک عظیم تاریخ اور روایت کے امین ہیں، اس خصوص میں پھر سے کم بستہ ہو جائیں۔ مخدوم نے بہت پہلے کہا تھا:

اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

میں ان چند گزارشات اور کلمات کے ساتھ اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی اس ''دیر آید درست آید'' کانفرنس کا افتتاح کرتا ہوں۔

(بشکریہ روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد)

□□□

محمد نعمان خاں

قومی درسیات کا خاکہ — 2005

آزاد ہندوستان میں قومی سطح پر اسکولی نظام تعلیم کی اصلاح اور بہتری نیز اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں جن اداروں نے بنیادی کردار ادا کیا ہے ان میں NCERT کا نام سرفہرست ہے۔

NCERT محکمۂ فروغ انسانی وسائل، حکومتِ ہند کا خودمختار قومی ادارہ ہے۔ اس کا قیام یکم ستمبر 1961 کو عمل میں آیا۔ اس کے تحت اسکولی تعلیمی نظام کی اصلاح، ترقی اور بہتری کے لیے جو بنیادی کام انجام دیے جاتے ہیں ان میں قومی درسیات کا خاکہ (National Curriculum Frame Work) تیار کرنا اور وقتاً فوقتاً اس پر نظرثانی، مختلف مضامین کے نصابات (Syllabi) کی از سر نو ترتیب، اساتذہ کی تربیت نیز تعلیمی امور پر تحقیق اور تجزیہ شامل ہیں۔ این سی ای آر ٹی کی زیرنگرانی بھوپال، بھونیشور، میسور، اجمیر اور شیلانگ میں پانچ RIES (ریجنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن) اور ڈمانس ٹریشن اسکولوں کے علاوہ پنڈت سندر لال شرما ووکیشنل اسٹڈی سینٹر (بھوپال) میں درس و تدریس کا کام انجام دیا جاتا ہے۔

اسکولی نظام تعلیم کا متواتر تجزیہ، اصلاح اور ترمیم این سی ای آر ٹی کے مستقلاً انجام دیے جانے والے کاموں کا حصہ ہے۔ مذکورہ بالا تمام کام کونسل (NCERT) کے ان مقاصد کو منعکس کرتے ہیں جن کے تحت یہ ادارہ، قومی تعلیمی پالیسی کے موثر نفاذ اور قومی درسیات کے خاکے کی تجدید کاری کے تئیں منسلک ایک تحقیقی ادارے کے طور پر مصروف کار ہے۔

تبدیلی فطری عمل ہے لہٰذا ہر پانچ سال بعد قومی درسیات کے خاکے پر نظرثانی اس وجہ سے کی جاتی ہے تاکہ اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے مزید بہتر اور مفید بنایا جاسکے۔ NCERT کی عاملہ کمیٹی نے 14 اور 19 جولائی 2004 کی نشستوں میں 'قومی درسیات کا خاکہ' پر نظرثانی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس ضمن میں پروفیسر یش پال کی زیرصدارت ایک ''قومی کارپرداز کمیٹی'' (نیشنل اسٹیرنگ کمیٹی) اور 21 فوکس گروپس کی تشکیل عمل میں آئی۔ تشکیل شدہ کمیٹیوں میں این سی ای آر ٹی فیکلٹی، اعلیٰ تعلیمی اداروں اور اسکولوں کے اساتذہ، غیرسرکاری تنظیموں کے نمائندگان شامل تھے۔ ملک کے مختلف شہروں میں اعلیٰ سطحی سیمینار منعقد کیے گئے۔ قومی اور علاقائی اخبارات میں اشتہارات دیے گئے۔ تمام SCERTs ریاستی تعلیمی بورڈوں اور دیہی علاقوں کے اساتذہ اور ماہرین تعلیم سے مشورے کیے گئے۔ اس طرح عصری تقاضوں اور مسائل کے پیش نظر NCF-2005 کی شکل میں ایک وقیع دستاویز تیار کی گئی۔

ترمیم شدہ ''قومی درسیات کا خاکہ —2005'' میں کئی اہم نکات پہلی بار پیش کیے گئے ہیں۔ اس دستاویز میں تعلیم کے واضح مقاصد کی نشان دہی ہی نہیں کی گئی ہے بلکہ دست کاری و فنون لطیفہ، مساوات، سماجی انصاف، اخلاقی اقدار، سیکولرزم، آئین ہند کی پاسداری، ماحولیات، کثیرلسانیت کے ساتھ فرد کی اہمیت، غور و فکر کی آزادی، تخلیقی طریقۂ کار کے فروغ، جمہوری طریقۂ عمل نیز سماجی تبدیلی میں حصے داری کے لیے کام کرنے کی اہلیت پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ طلبہ پر تعلیمی بوجھ کم کرنے اور مسرت بخش آموزش (Joyful learning) کے لیے اس دستاویز میں حسب ذیل پانچ رہنما اصولوں پر عمل آوری کی تجویز پیش کی گئی ہے:

- i علم کو اسکول سے باہر کی زندگی سے منسلک کرنا۔
- ii رٹنے کے طریقۂ کار کی حوصلہ شکنی کو یقینی بنانا۔
- iii درسیاتی عمل کو محض درسی کتب تک محدود نہ کر کے اسے مزید آگے بڑھانا۔
- iv امتحانات میں نرم روی اختیار کر کے انھیں جماعت کے ماحول سے ہم آہنگ کرنا۔
- v قومی احساس سے مملو جمہوری نظام کی نشو و نما۔

اس دستاویز میں درسیات کے چار نمایاں دائرے یعنی: زبان، ریاضی، سائنس اور سوشل سائنس میں حال اور مستقبل کی ضرورتوں کے پیش نظر کئی بامعنی تبدیلیوں کی سفارش کی گئی ہے۔

''قومی درسیات کا خاکہ —2005'' اس امر کی سفارش کرتا ہے کہ مضامین کے مابین حد بندیوں کو اس لیے ختم کردیا جائے تاکہ طلبہ آموزش کا فطری لطف حاصل کرسکیں۔ نصابی کتب اور دیگر مواد کی تکثیریت کے ساتھ سہ لسانی فارمولے پر عمل پیرا ہونے کی از سر نو کوشش پر اس دستاویز میں خاص توجہ دی گئی ہے تاکہ قبائلی زبانوں سمیت طلبہ کی مادری زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنایا جاسکے۔ یہ عمل ہندوستان کے کثیرلسانی کردار کو مستحکم بنانے کا موثر ذریعہ ہے۔

اس دستاویز میں چار اہم شعبوں کی جانب خاص طور پر توجہ دی گئی ہے:

- i کام
- ii فنون اور روایتی دست کاریاں
- iii صحت اور جسمانی تعلیم
- iv امن

کام پر اس لیے توجہ دی گئی ہے کہ یہ علم کو تجربے میں تبدیل کردیتا ہے اور

خود کفالتی نیز امداد باہمی کی صلاحیت کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

دست کاری پر اس لیے زور دیا گیا ہے تاکہ علاقائی دست کاری کو فروغ حاصل ہو سکے۔ فنون میں موسیقی، رقص، تھیٹر اور بصری فن شامل ہیں۔ اس کا مقصد طلبہ میں تخلیقی، جمالیاتی اور شخصی شعور کی حوصلہ افزائی ہے۔

صحت اور جسمانی تعلیم کے لیے ماقبل اسکولی سطح سے اوپری سطح تک لڑکوں اور لڑکیوں پر مساوی توجہ ضروری ہے۔

فی زمانہ دہشت گردی اور تشدد کے بڑھتے اثرات کے پیش نظر یہ سفارش کی گئی ہے کہ امن کو قومی تعمیر کے لازمی جزو کے بطور اختیار کیا جائے۔ بچوں کو اچھا شہری اور بہتر انسان بنانے کے لیے امن کی تعلیم کو مختلف سرگرمیوں کے ذریعے ہر سطح اور ہر مضمون میں شامل کیے جانے کی ضرورت ہے۔ اسکولی نظام کو بہتر بنانے کے لیے نظام الاوقات (Time Table) میں لچکیلا پن لانا ضروری ہے۔ چنانچہ اس امر کے لیے لچک دار اسکولی کلینڈر کی سفارش کی گئی ہے۔

''قومی درسیات کا خاکہ —2005'' میں سینئر سیکنڈری سطح پر اختیارات میں تکثیریت اور کشادگی کی اہمیت پر خاص زور دیا گیا ہے۔

اس دستاویز میں تعلیمی نظام کی اصلاحات سے متعلق جو اہم تجاویز پیش کی گئی ہیں ان میں پنچایتی راج اداروں کو زیادہ مضبوط بنانے، ماحولیات نیز اسکولی سطح پر صحیح تعلیمی منصوبہ بندی پر توجہ دینا شامل ہے۔

درسیات کی اصلاح کے لیے سب سے اہم قدم 'امتحانات' (خصوصاً دسویں، بارھویں جماعتوں) کے طریقۂ کار کی اصلاح ہے تاکہ طلبہ نیز والدین پر بڑھتے ذہنی اور نفسیاتی دباؤ کا حل تلاش کیا جا سکے۔ اس ضمن میں سوال ناموں کی نوعیت اور ان کے فارمٹ میں ضروری تبدیلی کی جانی چاہیے تاکہ امتحانات کو طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں اور جماعت کی سرگرمیوں سے منسلک کیا جا سکے اور رٹنے کی روایت کی حوصلہ شکنی ہو سکے۔

یہ دستاویز اسکولی نظام اور دیگر سماجی گروپوں کے مابین شراکت کی دعوت دیتی ہے۔ موثر تعلیم کی جڑیں طلبہ کی مادری اور تہذیبی زمین میں پیوست ہوتی ہیں اور انھیں والدین، اساتذہ، ہم جماعت ساتھیوں نیز معاشرے کے باہمی تعامل سے غذا حاصل ہوتی ہے۔ اگر بچوں کو آزادانہ آموزش کے مواقع فراہم کیے جائیں تو ان کی فطری صلاحیتوں اور تخلیقی قوتوں میں خاطر خواہ نکھار پیدا ہوتا ہے اور وہ لطف و مسرت نیز خود اعتمادی کی دولت سے ہمکنار ہوتے ہیں لہٰذا اس امر کو یقینی بنانا ضروری ہے کہ درسی کتب بچوں میں ذہنی تناؤ اور بے زاری کا سبب بننے کے بجائے ان کی اسکولی زندگی کو خوشگوار اور دلچسپ بنانے میں موثر ثابت ہو سکیں۔

''قومی درسیات کا خاکہ —2005'' میں قومی تعلیمی پالیسی 1986 میں مذکور ''تعلیم کے طفل مرکوز نظام'' پر ہی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے بلکہ میڈیا اور تعلیمی تکنیک کی اہمیت و ضرورت کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہ خاکہ تخلیقی مزاج (Creative Sprit) اور تعمیری طریق عمل (Constructive Approach) کی وکالت کرتا ہے۔ آموزش کے دیگر ذرائع کو نظر انداز کرنے کے اسباب میں ایک بنیادی سبب مجوزہ درسی کتب کو امتحان کے لیے واحد ذریعہ بنانا ہے۔ یہ خاکہ اس طریقۂ کار سے احتراز کا مشورہ دیتا ہے۔

نصابی بوجھ کم کرنے کے سلسلے میں درج ذیل امور پر زور دیا گیا ہے:

☆ درسی کتب محض ضخامت کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ انتخاب متن کے لحاظ سے بھی بچوں کے کاندھوں اور ان کے ذہنوں پر بوجھ نہ بن سکیں۔

☆ نفس مضمون کا تمام مواد بچوں کی ذہنی سطح، ان کی نفسیات اور پسند کے عین مطابق ہو۔

☆ اسکول کے مختلف مضامین کے مابین تال میل۔

☆ ایک سطح اور اگلی سطح کے درمیان تسلسل۔

☆ اسکولی تعلیم اور بچوں کی روزمرہ زندگی کے معمولات سے حاصل شدہ تجربات کے درمیان ہم آہنگی۔ نئی سطر کی تمام سطحوں اور مضامین میں ماحولیات کا انعکاس۔

☆ معذوروں کے تئیں ہم دردی نیز جنسی مساوات کا لحاظ۔

☆ نئی تعلیمی تکنیک اور طریقۂ کار کا جس میں نئی اطلاعاتی تکنیک شامل ہے، موثر استعمال۔

☆ کثیر لسانی عمل (Multilingualism) کے فروغ کی تدابیر۔

☆ مشقوں نیز عملی سرگرمیوں کے ذریعے طلبہ مرکوز نظام تعلیم پر زور۔

'CABE' سے منظور شدہ ''قومی درسیات کا خاکہ —2005'' کی اشاعت بشمول اردو زبان ہندوستان کی 22 زبانوں میں عمل میں آچکی ہے۔ یہ ایک ایسی مثالی دستاویز ہے جس کی روشنی میں NCERT تمام مضامین کی درسی کتب کے لیے نصابات (Syllabi) مرتب کر کے مثالی درسی کتب (Model Textbooks) تیار کرتی ہے اور اکثر ریاستوں کی SCERT's یا تعلیمی بورڈس NCF کی روشنی میں SCF اور درسی کتب مرتب کرتے ہیں یا انھیں بعینہٖ قبول کر لیتے ہیں۔

اسکولی تعلیم سے متعلق تمام مضامین کا نصاب NCF کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے اور اس بات کی پوری کوشش کی گئی کہ قومی درسیات کے خاکے میں پیش کردہ تمام نکات اور سفارشات کا احاطہ ہو جائے۔ نصابات کی ترتیب کے لیے مختلف ورک شاپ منعقد کیے گئے جن میں شریک اسکول اساتذہ نیز ماہرین تعلیم کے باہمی مشورے سے بشمول اردو، مختلف سطحوں کے لیے بھی مضامین

کے نصاب کو آخری شکل دی گئی۔ تیار شدہ نصاب کی روشنی میں تین مراحل (Three Phases) میں سبھی مضامین میں پہلی سے بارھویں جماعت تک کی درسی کتب تیار کرکے شائع کی گئی ہیں۔ پہلے مرحلے میں پہلی، تیسری، چھٹی، نویں اور گیارھویں جماعتوں کے لیے، دوسرے مرحلے میں دوسری، چوتھی، ساتویں، دسویں اور بارھویں جماعتوں کے لیے اور تیسرے اور آخری مرحلے میں پانچویں اور آٹھویں جماعتوں کے واسطے درسی کتب کے ساتھ معاون درسی کتب (Supplementary Readers) چھٹی سے بارھویں جماعتوں کے لیے تیار کرکے شائع کی گئیں ہیں۔ ابتدائی سطح کی پہلی سے پانچویں جماعتوں کی درسی کتب میں دی جانے والی مشقوں کے ساتھ ساتھ مشقی کتب (Work books) بھی شامل ہیں۔

مختلف اوقات میں منعقدہ ورک شاپ میں شرکا نے Syllabi, NCF-2005 اور عصری تقاضوں کے پیش نظر نہایت غور وخوض اور باہمی صلاح ومشورے کے بعد ان درسی کتب کو آخری شکل دی ہے۔ ان درسی کتب میں متن کا انتخاب بچوں کی نفسیات، ذہنی سطح، دلچسپی، پسند اور جماعت کے معیار کو ملحوظ رکھ کر کیا گیا ہے اور تفہیمی مشقوں اور عملی سرگرمیوں پر خاص توجہ دی گئی ہے تاکہ طلبہ کی ذہنی، فکری، تخلیقی اور تفہیمی صلاحیتوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوسکے۔ بچوں کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے درسی کتب کے ظاہری حسن یعنی معیاری کاغذ، مناسب فونٹ سائز، رنگین تصاویر، اسکیچز، خوبصورت سرورق کا اہتمام کیا گیا ہے۔

کونسل کے شعبۂ زبان کے زیر اہتمام ایک تعلیمی مجلّہ (سہ ماہی) کی اشاعت کا آغاز چار زبانوں (ہندی، اردو، سنسکرت اور انگریزی) میں کیا جارہا ہے۔ اس مجلّے میں متعلقہ چاروں زبانوں کی تدریس وتعلیم سے متعلق علمی، تحقیقی اور تکنیکی نوعیت کے مضامین شائع کیے جائیں گے۔

مضمون خواہ کوئی بھی ہو ہر مضمون کی تدریس دراصل زبان کی تدریس ہے کہ زبان کے سہارے کے بغیر کسی بھی مضمون کی تدریس ممکن نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ کونسل نے زبان کی تدریس پر خاص توجہ صرف کی ہے۔ زبان کی تفہیم اور ترسیل کے لیے موثر طریقۂ تدریس نہایت ضروری ہے تاکہ طلبہ میں حرف شناسی، زبان دانی، قواعد شناسی، ادب شناسی، آزادانہ غور وفکر، ترسیل و ابلاغ، تبادلۂ خیال نیز اظہار کی صلاحیتیں پیدا ہوسکیں۔ اس کا مقصد طلبہ کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا ہی نہیں، انھیں کامیاب عملی زندگی کے لیے فعال بنانا بھی ہے۔ این سی ای آر ٹی کی درسی کتب میں ان باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

تدریس کے اہم عوامل میں جائزہ (Evaluation) تعین قدر اور باز تحصیل (Feedback) شامل ہیں۔ کونسل میں یہ کام متواتر جاری ہے اور اس کے تحت حاصل شدہ تجاویز وآرا کو باز طباعت (Reprint) میں شامل کردیا جاتا ہے۔ اس طرح تصحیح وترمیم کا یہ سلسلہ درسی کتب کو بہتر سے بہترین بنانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

NCERT بچوں کے تعلیمی ذوق وشوق کو بڑھانے کے لیے Talent Search Scheme کے تحت فیلوشپ بھی تفویض کرتی ہے اور تحقیقی کام انجام دینے والے ریسرچ اسکالرس کو وظیفہ دیتی ہے۔ کونسل تعلیمی امور سے متعلق ملک گیر سطح پر تحقیقی اعداد وشمار جمع کرکے ان کی رپورٹس شائع کرتی ہے۔ یہ رپورٹس قومی تعلیمی پالیسی کے مطالبات کی تکمیل میں مدد ومعاون ثابت ہوتی ہیں۔

□□□

پتہ:
Deptt. of Languages, NCERT, New Delhi

دکنی لغت

مرتبہ: سیّدہ جعفر

دکنی شعر وادب کی تفہیم، ہماری ادب فہمی کا ایک اہم پہلو ہے۔ پروفیسر سیّدہ جعفر نے، جو اردو زبان وادب کی تاریخ پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ دکنیات کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتی ہیں، اس لغت کی تدوین وترتیب میں شمس الرحمٰن فاروقی، مغنی تبسم اور محمد نسیم الدین فریس جیسی شخصیات سے استفادہ کرتے ہوئے اس میں دکنی الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، روزمرّہ، تکیہ کلام اور ان کے معانی کی مختلف جہات کا احاطہ کیا ہے۔ ساڑھے پانچ سو برس قدیم ان دکنی الفاظ کا صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اس لیے ناگزیر ہے کہ زیر اور زبر سے معنی میں بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ طلبہ واساتذہ کی اسی ضرورت اور سہولت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے حال ہی میں یہ لغت شائع کی ہے۔

صفحات — 521، قیمت — 590 روپے

اقتدار حسین صدیقی

عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں صوفیائے کرام کا رول

دنیا کے دوسرے عظیم مذاہب کی طرح مذہب اسلام میں بھی مابعد الطبیعیاتی فلسفہ (یا تصوف) سے متعلق رجحانات کی نشو ونما داخلی روحانی قیاس آرائی اور مذہبی فکر کے ارتقا کی صورت میں ہوئی۔ علاوہ ازیں جب دولت کی فراوانی نے (جس کا موجب مختلف ممالک کی فتح اور تجارت کا فروغ تھا) مسلمانوں میں عیش وعشرت کا شوق اور صارفانہ رجحانات پیدا کیے تو نتیجے میں مذہبی جذبہ کمزور ہونے لگا۔ حساس مسلمانوں میں صارفیت کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا اور مذہب اور روحانی اقدار کے تحفظ کے لیے تبلیغ اور تعلیم کی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ کچھ فضلا نے خانقاہی نظام کو اپنا کر رشد و ہدایت کا کام شروع کیا۔ ان کے پیرو ان کی بے لوث دینی خدمت اور عمل سے متاثر ہو کر مسلمانوں کی روحانی تربیت اور اصلاح کے سلسلے میں سرگرم عمل ہوگئے۔ جلد ہی ان کی مساعی کے سبب سے تاریخ اسلام میں تصوف ایک منظم تحریک، جامع فلسفہ (مابعد الطبیعیاتی فلسفہ) اور ہمہ گیر تصور حیات کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔

تصوف کی بنیاد قرآنی تعلیمات اور سنت رسول اللہ پر رکھی گئی تھی۔ اس تحریک کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظریہ ہے اور دوسرا طرز زندگی۔ بحیثیت نظریے کے تصوف علم کلام سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں موضوع بحث ہے اللہ تعالیٰ کی ماورائیت یعنی (transcendence) کے ساتھ ساتھ اس کا کائنات میں محیط کل ہونا (یعنی (Imomanence)۔ اس نظریے کے تحت روحانی فکر اور قیاس آرائی نے مابعد الطبیعیاتی فلسفے کو فروغ دیا جس کا رخ کائنات کی طرف اور لہجہ آفاقی ہے لہٰذا تصوف کے حامیوں کی کاوش کا محور ہمیشہ کائنات سے ہم آہنگی رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نمائندہ صوفیا کے یہاں مذہبی رواداری کے ساتھ ساتھ وسیع النظری پاتے ہیں۔ ابتدائی دور کے صوفیا نے دوسرے مذاہب کی روایات کے بارے میں صرف علم ہی حاصل نہیں کیا بلکہ ان کو سراہا اور اپنایا بھی اگر وہ اسلامی تعلیمات سے متصادم نہیں تھیں۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ان ابتدائی دور کے چند صوفیا نے ہمعصر فضلا کی طرف نو افلاطونی فلسفے سے متاثر ہو کر ایسے افکار اور تصورات کو اپنا لیا تھا جو کہ قرآنی تعلیم کی روح کے خلاف تھے جیسے منصور حلاج کا تصور حلول۔ حلاج کے قتل کے بعد صوفیا نے احتیاط سے کام لیا اور قرآن اور حدیث کی پیروی پر زیادہ زور دیا۔

صوفیا نے اپنے مریدوں کی روحانی تربیت ہی نہیں کی بلکہ ان کی کوشش اور دلچسپی کے نتیجے میں علم و ادب کو بھی فروغ ملا۔ صوفیا تعلیم اور تدریس میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ بہت سے صوفیا کی خانقاہوں سے شعرا اور ادبا بھی وابستہ رہتے تھے اور شیخ اپنے مریدوں میں اگر کسی فن کی صلاحیت پاتے تھے تو اس کو کمال تک لے جانے میں مرید کی ہر طرح ہمت افزائی کرتے تھے۔ صوفیا کی انسان دوستی کا اثر مرید شاعر کے کلام سے جھلکتا ہے۔ ان شعرا کے کلام کے اثر سے شاعری میں نازک خیالی اور عشق اور حسن سے متعلق بوالہوسی سے پاک جذبات کی عکاسی ممکن ہوسکی۔ ان جملہ خوبیوں کے علم کے لیے صوفی شعرا کی تمثیلی مثنویات کا مطالعہ ضروری ہے۔

ہندوستان میں صوفیا کی تاریخ میں شیخ علی ہجویری عرف داتا گنج بخش سرفہرست ہیں۔ یہ بارھویں صدی عیسوی میں غزنی سے آکر لاہور میں سکونت گزیں ہوگئے تھے۔ اس زمانے میں لاہور غزنی سلطنت کا ہندوستان میں فوجی مرکز اور پنجاب کا صدر مقام بننے کے بعد ایک شہر کی صورت میں ابھر رہا تھا۔ وہاں مسلمانوں کی اچھی تعداد ہوگئی تھی۔ مسلمانوں کی روحانی تربیت کے لیے شیخ علی ہجویری کے پیر شیخ محمد بن حسن الختلی نے پہلے شیخ حسین زنجانی کو لاہور بھیجا تھا۔ لاہور میں شیخ حسین زنجانی کے انتقال کے بعد وہاں شیخ علی ہجویری آئے اور رشد و ہدایت کے کام میں مصروف ہوگئے۔(1)

شیخ علی ہجویری کئی اعتبار سے عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ وہ عربی اور فارسی زبانوں میں کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی کتابوں میں ''کشف المحجوب'' فارسی نثر میں تصوف پر لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ اس میں تصوف کے رموز اور اصول سے متعلق روایات کی توجیہہ اور تشریح کے علاوہ اسلام کے ابتدائی صوفیا سے لے کر ان کے اپنے زمانے تک کے نمائندہ صوفیا کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ موضوع کی اہمیت اور بلند علمی معیار کی وجہ سے اس کو آنے والی نسلوں نے مفقود ہونے سے بچایا جبکہ شیخ ہجویری کی دوسری تصانیف استداد زمانہ کا شکار ہوگئیں۔ امیر خسرو کی نظر میں ''کشف المحجوب'' عہد آفریں تھی کیونکہ اس سے فارسی نثر میں ایک اسلوب تحریر کا آغاز ہوا۔(2)

شیخ علی ہجویری سلسلۂ جلیدیہ سے تعلق رکھتے تھے(3) ان کے پیروؤں او رجانشینوں کے بارے میں ہمارے ماخذ کوئی اطلاع نہیں دیتے۔ ہندوستان میں صوفی سلسلوں کی تاریخ کے دور کا آغاز تیرھویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے۔ اس صدی کے آغاز پر دہلی سلطنت کے قائم ہونے کے بعد یہاں مختلف صوفی سلسلوں کے نمائندے مختلف ممالک سے آئے اور انھوں نے دہلی سلطنت کے مختلف شہروں میں سکونت اختیار کرلی۔ پہلے خانقاہیں تعمیر ہوئیں اور بعد میں درگاہیں قائم ہوئیں۔ سلطنت کے ابتدائی زمانے میں متعارف ہونے والے

سلسلوں میں سہروردیہ، چشتیہ اور قلندریہ سلسلے تھے۔ نو وارد صوفیا کی مادری زبان فارسی تھی۔ یہ لوگ 1220 میں وسط ایشیا اور خراسان پر چنگیز خاں کے حملوں سے بچ کر ہندوستان میں مہاجر کی صورت میں آئے تھے۔ سلاطین نے مہاجرین کی ہر طرح مدد کی اور ان کو ملازمت بھی دی۔ سلطنت کے ابتدائی دور کے صوفیا میں صرف شیخ بہاء الدین زکریا ہندوستانی نژاد تھے اور انھوں نے ہندوستان میں سہروردیہ سلسلے کو قائم کیا۔ اگرچہ ان کی مادری زبان ہندوستانی تھی۔ (غالباً سرائیکی) لیکن وہ عربی اور فارسی زبانوں کے بھی عالم تھے۔ ان کے برعکس چشتیہ سلسلے کو ہندوستان میں متعارف کرانے والے بزرگ شیخ معین الدین سجزی خراسان سے آئے تھے۔ ان کے علاوہ شیخ نجم الدین کبریٰ سہروردی کے پیرو بھی ہندوستان آئے اور ان کے پیرو بعد میں فردوسی کہلا نے لگے۔ قلندریہ سلسلے کے صوفی قلندر بھی وسط ایشیا سے آئے جو کہ اپنے طور طریقوں کی بنا پر عوام میں زیادہ مقبول ہوئے۔

سلسلوں کی تفریق کے بغیر عام طور پر صوفیا نے اپنی روایات کے مطابق ہندوستان میں بھی غیر مسلم خواص سے ربط قائم کیا اور ہندوؤں کے روحانی فلسفے میں دلچسپی ظاہر کی۔ یوگا کے فلسفے سے کچھ صوفیا متاثر بھی ہوئے انھوں نے یوگا پر سنسکرت کتاب ''امرت کنڈ'' کا فارسی زبان میں ترجمہ کرایا اور اس ترجمے کا نام ''حوض الحیات'' رکھا۔[4] یوگا میں پاس انفاس یا حبس دم کے طریقے نے صوفیا کو متاثر کیا کیونکہ یہ روحانی سفر میں ترقی کے لیے معاون سمجھا جاتا تھا۔ اس کے اپنانے کے دفاع اور جواز میں صوفیا نے اس کو نماز مصطفیٰ اور صلوٰۃ معکوس کے نام دیے۔[5] ہندوستان میں سب سے پہلے چشتی بزرگ شیخ فریدالدین گنج شکر نے چلہ معکوس انجام دیا لیکن انھوں نے اس کو اپنے مریدوں کے لیے ضروری نہیں سمجھا اور کبھی کسی کو تلقین نہیں کی۔[6]

ہندو یوگیوں (جوگیوں) سے صوفیا کے قریبی تعلقات کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ہندو جوگی شیخ فریدالدین گنج شکر کی خانقاہ میں آتے تھے۔ ان کے اور شیخ کے مریدوں کے درمیان ہندو مذہبی فلسفے پر گفتگو ہوتی تھی۔ شیخ گنج شکر کی ہی خانقاہ میں حضرت شیخ نظام الدین (اولیاؒ) کی جوگیوں سے ملاقات ہوئی تھی۔[7] شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے بھی جو کہ ہندوستانی صوفیا میں مابعد الطبیعیاتی فلسفے کے عظیم ترین مفکر صوفی ہوئے ہیں، جوگیوں کے ساتھ راجگیر کے جنگل میں کئی سال زہد اور ریاضت میں گزارے تھے۔[8]

صوفیا نے خدمت خلق کے سلسلے میں لنگر کے کلچر کا آغاز کیا جہاں سے روزانہ غربا کو مفت کھانا ملتا تھا۔ اس ضمن میں صوفیا کے ترک دنیا کے تصور کی وضاحت ضروری ہے کیونکہ وہ اس معاملے میں دوسرے مذاہب کے درویشوں سے مختلف تھے۔ غیر مسلم درویش فقیر کسی مذہبی تفریق اور امتیاز کے راہبانہ زندگی کو نجات کا باعث سمجھتے تھے۔ عیسائی راہبان دنیا اور اہل دنیا سے قطع تعلق کر کے خلوت خانوں (Monastries) میں رہتے تھے۔ بدھ مذہب کے بھکشو اور ہندو سنیاسی بھی جنگلوں، پہاڑوں کی گپھاؤں اور دور افتادہ وہاروں میں رہ کر عبادت اور ریاضت میں مشغول رہنا اپنا مذہبی مشن سمجھتے تھے۔ برخلاف ان کے صوفیا کے یہاں ترک دنیا کا مطلب تھا انسانوں کے درمیان رہ کر صفائی قلب کے لیے دنیاوی اشیا کی خواہش، لالچ اور انسانوں کے خلاف انتقامی جذبے سے پاک اور صاف ہو کر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے لیے اللہ کے بندوں کی بے لوث خدمت کرنا تھا۔ وہ خدمت خلق اور انسان دوستی کو اللہ کی عبادت کا متبادل تصور کرتے تھے۔ حضرت نظام الدین (م 1325) فرماتے تھے کہ عبادت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک طاعت لازمی جیسے نماز، روزہ وغیرہ اور دوسری طاعت متعدی۔ طاعت متعدی کا مطلب ہے کہ دوسرے انسانوں کی بھلائی کے لیے کام کرنا۔ وہ طاعت متعدی کو طاعت لازمی سے زیادہ اہم بتاتے تھے۔[9] اسی تصور کا اثر تھا کہ حضرت نظام الدین اور ان کے پیر و مرشد شیخ فریدالدین گنج شکر غلامی کے ادارے کے خلاف نظر آتے ہیں۔ دونوں کی تعلیم کے اثر سے ان کے اہل ثروت مرید غلاموں کو خرید کر آزاد کر دیا کرتے تھے اپنے مرشد کے بارے میں حضرت نظام الدین (اولیاؒ) نے مریدوں کو بتایا کہ ناگور کے قاضی شرف الدین شیخ فریدالدین گنج شکر کے مرید تھے۔ انھوں نے ایک نوعمر حسین کنیز کو سو ٹنکوں (چاندی کے سکے) میں خریدا۔ کچھ دنوں کے بعد قاضی شرف الدین ناگوری نے اپنے مرشد سے ملاقات کرنے کا ارادہ کیا۔ جب انھوں نے اجودھن کے لیے سفر کی تیاری کی تو ان کی کنیز نے حلویٰ بنایا اور کپڑے میں باندھ کر اپنے آقا کو دیا کہ وہ شیخ کو اس کی جانب سے تحفہ پیش کر دیں۔ اجودھن پہنچ کر جب مرید اپنے مرشد سے ملے تو نذر کے ساتھ کنیز کا تحفہ پیش کرتے ہوئے اس کے بارے میں بتایا کہ وہ اس کی کنیز کی طرف سے ہے۔ شیخ خوش ہوئے اور فوراً دعا کے طور پر فرمایا، اللہ اس کو آزادی سے نوازے۔ شیخ کی دعا سن کر قاضی شرف الدین نے خیال کیا کہ ان کے پیر کی دعا قبول ہوتی ہے لہٰذا کنیز کو جلد آزادی مل جائے گی اس لیے اچھا ہوگا کہ وہ ناگور واپسی پر اس حسین کنیز کو فروخت کر دیں تاکہ نقصان سے بچ جائیں۔ ان کو یقین تھا کہ اس کا خریدار اس کو آزاد کر دے گا۔ لیکن تھوڑے لمحے کے بعد محسوس کیا کہ اگر وہ خود اس کو آزاد کر دیں گے تو اپنے مرشد کی خوشنودی حاصل کریں گے۔ وہ فوراً شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو بتایا کہ انھوں نے کنیز کو آزاد کر دیا ہے۔[10] یہی عمل حضرت نظام الدین (اولیاؒ) کے مریدوں کا تھا۔ مثال کے طور پر میر حسن سجزی دیوگیری (دکن) گئے ہوئے تھے فوجی مہم کے ہمراہ۔ وہاں ان کے آزاد کردہ ملازم عتیق ملیح نے پانچ ٹنکوں میں ایک بچی خریدی۔ جب کچھ دنوں کے بعد دہلی واپس ہونے والے تھے تو بچی کے ماں باپ آئے اور عتیق ملیح کو دس تنکے پیش کرتے ہوئے رو کر کہنے لگے کہ وہ اپنا سارا اثاثہ فروخت کر کے دس تنکے لائے ہیں تاکہ وہ اپنی بچی کو واپس

لے لیں کیونکہ وہ اس کی جدائی برداشت نہیں کرسکتے۔ جب حسن سجزی نے ماں باپ کی حالت دیکھی تو انھوں نے خود دس ٹنکے اپنے ملازمت کو دیے اور بچی کو خرید کر اس کے ماں باپ کے حوالے کردیا۔ ان سے کہا وہ اپنے دس ٹنکے اپنے اوپر خرچ کریں۔ دہلی واپس آنے پر جب حضرت کی خانقاہ میں حاضر ہوئے تو یہ واقعہ ان کو سنایا۔ حضرت اس قدر خوش ہوئے کہ اپنے سر سے ٹوپی اتاری اور حسن سجزی کے سر پر رکھ دی۔ مرید کے لیے اس سے بڑا کیا انعام ہوسکتا تھا[11] اس واقعہ سے پہلے حسن سجزی نے اپنے غلام بشیر کو بھی آزاد کردیا تھا اور آخر الذکر حضرت نظام الدین (اولیاؒ) کے حلقۂ مریدین میں شامل ہوگیا تھا[12] بہرحال صوفیا کی انسان دوستی کے تصور سے غیر مسلم متاثر ہوئے۔ سکھ گوارووں میں لنگر کا جاری رہنا عہد وسطیٰ کے خانقاہی نظام کی یاددہانی کراتا ہے۔

صوفیا کے متعلق ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ انھوں نے ہندوؤں کو مسلمان بنایا۔ تاریخی حقائق اس کے برعکس معلوم ہوتے ہیں۔ صوفیا اپنی خانقاہوں میں رہ کر رشد و ہدایت کے کام میں مصروف رہتے تھے۔ مریدوں میں جو تعلیم یافتہ ہوتے تھے اور جذبۂ دینی سے سرشار اور جن سے پوری توقع ہوتی تھی کہ وہ مستقبل میں سلوک کی زندگی کی ذمے داریوں کا پاس رکھتے ہوئے مسلمانوں کی رہنمائی کرسکیں گے ان کی تربیت میں مصروف رہتے تھے۔ وہ دور جدید کی مشنریوں (مبلغین) کی طرح لوگوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کے سلسلے میں نہیں نکلتے تھے۔ کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ہے کہ جس سے ایسا شائبہ بھی ہو کہ کسی عظیم یا نمائندہ صوفی نے کسی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے کی تلقین کی ہو۔ بلکہ وہ اس طرح کی حرکت کو غیر اخلاقی فعل تصور کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک دن حضرت نظام الدین (اولیاؒ) کی خانقاہ میں ان کا ایک مرید اپنے ہندو بھائی کے ساتھ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ نے دیکھتے ہی مرید سے پوچھا: کیا تمھارا بھائی اسلام کی طرف رغبت رکھتا ہے؟ مرید نے جواب میں کہا کہ وہ عرصے سے کوشش کررہا ہے کہ اس کا بھائی مسلمان بن جائے لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اگر حضرت کی نظر کرم سے اس کا دل بدل جائے تو اس کی عاقبت درست ہوجائے گی۔ یہ سن کر حضرت نے فرمایا کہ وعظ اور پند سے کسی کا دل نہیں بدلتا بلکہ لوگوں کے اچھے اعمال اور ان کا دوسروں سے عمدہ سلوک لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس ضمن میں حضرت نے شیخ بایزید بسطامی اور ان کے عقیدت مند ایک یہودی کا قصہ بیان کیا کہ ایک یہودی شیخ بایزید بسطامی سے عقیدت رکھتا تھا اور اکثر ان سے ملنے کے لیے آتا تھا۔ شیخ بایزید کی رحلت کے بعد وہ ان کی قبر کی زیارت کے لیے آنے لگا۔ ایک دن کچھ مسلمانوں نے یہودی سے کہا کہ وہ شیخ سے عقیدت رکھتا ہے اور ان کے انتقال کے بعد بھی ان کی قبر کی زیارت کرتا ہے لیکن شیخ کا دین قبول نہیں کرتا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہودی نے جواب دیا کہ شیخ جس اسلام پر عمل پیرا تھے وہ اس کی پیروی کرنے کی اپنے اندر صلاحیت نہیں پاتا لیکن جہاں تک تمھارا اسلام ہے تو وہ اس سے بہتر اپنے مذہب کو پاتا ہے۔[13]

شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی خانقاہ میں بھی ہندو اور مسلمان حاضر ہوتے تھے۔ ایک ہندو یوگی ان سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اسلام قبول کرکے ان سے نیاز حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ شیخ نے اس یوگی کو تین دن اپنے ساتھ رکھ کر اس کی تربیت کی اور پھر رخصت کردیا۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ اس کو بغیر مسلمان بنائے واپس چلے جانے کی اجازت دے دی۔ لوگوں نے شیخ سے وجہ پوچھی تو شیخ نے فرمایا کہ توحید الٰہی کے بارے میں اس کی فہم میں کچھ کمی تھی اور جب اس کا مداوا ہوگیا صفائی قلب کے ذریعے تو مقصد پورا ہوگیا تھا۔ لہٰذا اس کو رخصت کردیا گیا۔ دراصل شیخ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی وحدت میں عقیدہ رکھنا ضروری تھا[14]

اٹھارھویں صدی عیسوی کے ایک قادری صوفی کی مثال بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ شیخ سید حسن رسول نما دہلی کے محترم صوفی تھے۔ ایک ہندو ان کے عقیدت مندوں میں شامل تھا۔ ایک دن اس ہندو نے شیخ سے درخواست کی کہ وہ اس کو مسلمان بنالیں۔ لیکن شیخ نے اس کو مسلمان بنانے سے انکار کردیا۔ لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ اگر وہ اس کو دائرۂ اسلام میں داخل کریں گے تو ان میں غرور پیدا ہوجائے گا جو کہ ان کے لیے روحانی نقصان کا باعث ہوگا[15] بہرحال یہ تاریخی حقیقت ہے کہ نمائندہ صوفی غیر مسلم لوگوں کو تلقین یا کسی طرح کا لالچ دے کر مسلمان بنانے کے قائل نہیں تھے۔ وہ اپنے مریدوں کو بھی اپنی ذاتی مثال اور کردار سے متاثر کرتے تھے۔

ہماری قومی مشترکہ تہذیب کی ترقی میں قلندریہ سلسلے کے درویشوں کے رول کا بھی اختصار کے ساتھ تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ دہلی سلطنت کے قائم ہونے کے بعد دوسرے صوفیا کی طرح قلندر صوفی بھی وسط ایشیا سے ہجرت کرکے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ اس وقت تک قلندریہ سلسلہ دو شاخوں میں بٹ چکا تھا۔ ایک شاخ کے پیرو القی کہلاتے تھے کیونکہ وہ چمڑے کا لباس زیب تن کرتے تھے وہ براہ راست اپنا تعلق قلندریہ سلسلے کے بانی شیخ محمد ابن یوسف جمال الدین ساوی (م 1232) سے بتاتے تھے۔ دوسری شاخ کے قلندر حیدری قلندر کہلاتے تھے کیونکہ وہ شیخ ساوی کے خلیفہ شیخ قطب الدین حیدر کے پیرو تھے۔ اپنی علاحدہ شناخت قائم کرنے کے لیے حیدری قلندر معمولی موٹے سوتی کپڑے پہنتے تھے اور ان کے اوپر لوہے کی زنجیریں لٹکائے رکھتے تھے۔ اس فرق کے علاوہ طرز زندگی دونوں شاخوں کے قلندروں کا یکساں تھا۔ دونوں ہی نہ گھر اور نہ خانقاہ بناتے تھے اور نہ ہی شادی کرتے تھے۔ مونچھ، داڑھی، بھنوئیں، پلکیں اور سر کے بال منڈواتے تھے۔ برابر ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت میں رہتے تھے۔ کسی سے مدد نہیں مانگتے تھے لوگ اپنی مرضی سے مدد

کرتے تھے۔ لیکن ہمارے معاصر ماخذ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں قلندر اخلاقی انحطاط کا شکار ہوگئے تھے۔ وہ مذہبی ارکان کی انجام دہی سے منحرف ہوکر نشہ آور اشیا جیسے بھنگ کا استعمال کرنے لگے تھے۔ صرف چند قلندر جیسے شیخ ابوبکر طوسی اور رزاق قلندر پرہیزگار درویش بتائے جاتے ہیں۔ رزاق قلندر کے لنگر سے کثیر تعداد میں لوگ کھانا پاتے تھے۔ شیخ نصیرالدین چراغ دہلی، بعد کے نامساعد حالات کے زمانے میں رزاق قلندر اور شیخ ملک یار پران کے لنگروں کو یاد کرکے فرماتے تھے کہ ان کا زمانہ کیا خوب تھا۔[16]

یہ امر بھی دلچسپ اور قابل ذکر ہے کہ ہندوستانی ماحول میں قلندروں نے ہندو یوگیوں کے بہت سے طور طریقے اختیار کر لیے تھے۔ ناتھ پنتھی یوگیوں کی طرح کچھ قلندر اپنے عضو تناسل میں لوہے کی سیخ گھسا کر اس کے دونوں سروں کو ملا دیتے اور پھر ان پر مہر لگا کر بند کر دیتے تھے۔ وہ سیخ مہر کہلاتے تھے۔[17]

اپنی بے راہ روی کے باوجود قلندر عوام میں خاص طور پر مقبول تھے۔ ہندو مسلم ان کی خدمت کو باعث سعادت سمجھتے تھے۔ کچھ خواص بھی عوام کی طرح ایسے درویشوں کی مدد میں دلچسپی لیتے تھے۔ مثال کے طور پر شیر شاہ سوری کے نامور جنرل مسند عالی خواص خان کے لشکر میں ہندو اور مسلم درویش رہتے تھے اور ان کی تمام ضروریات مسند عالی پوری کرتے تھے۔ ہندو مسلم درویشوں میں جوگیوں، برہمن منیوں، آتش پرستوں، قلندروں اور ملنگوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ملنگوں کا تذکرہ پہلی مرتبہ ملتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملنگوں کا سلسلہ سولھویں صدی میں قائم ہوا اور ہندوستانی نژاد تھا۔[18]

ہندوی زبان کی ترقی جس نے چودھویں صدی عیسوی میں رابطۂ عامہ کی بولی کی حیثیت حاصل کی اور بعد میں اردو کہلائی اس کے ارتقا میں بھی صوفیا کا رول کافی اہم رہا ہے۔ چودھویں صدی کی ابتدا میں مالوہ، گجرات اور دکن کے خطے دہلی سلطنت میں شامل کیے گئے تو وہاں نظم و نسق قائم کرنے کے لیے دہلی سے فوجیں اور افسران اور علما بھیجے گئے جن کے ذریعے وہاں دہلی کی بولی پہنچی۔ مقامی لوگوں نے نئے حکمراں طبقے سے تعلق قائم ہونے پر دہلی کی بولی یعنی ہندوی کو سیکھا اور ہر جگہ مقامی بولی کے ساتھ ساتھ ہندوی کا چلن ہوا۔ خلجی سلاطین کے عہد کے بعد سلطان محمد بن تغلق شاہ نے 1327 میں دہلی کی پوری آبادی، جو کئی لاکھ پر مشتمل تھی، دکن میں نئے شہر دولت آباد منتقل کر دی۔ سلطان کا مقصد دہلی کی طرح دکن میں بھی مسلم تہذیب کے مراکز قائم کرنا تھا تاکہ ان کی وجہ سے وہاں اس کی حکومت کو استحکام مل سکے۔ اس حکمت عملی کا ہندوی کے حق میں خوشگوار نتیجہ برآمد ہوا۔ دہلی کے قدیم باشندوں نے دکن میں اپنی تہذیبی روایات اور ہندوی کو محفوظ رکھا حالانکہ ان علاقوں میں جو زبانیں بولی جاتی تھیں وہ قدیم مراٹھی، تیلگو اور کنڑا زبانیں تھیں۔ اسی طرح گجرات میں بھی دہلی کی ہندوی محفوظ رہی جبکہ وہاں کی علاقائی زبان گجراتی تھی۔ ہر جگہ مسلمان مقامی زبان کی بجائے اپنے گھروں میں اپنی مادری زبان ہندوی بولتے تھے۔ گجرات اور دکن کی ہندوی زبان کے نمونے جو کہ وہاں کے صوفیا کے ملفوظات میں ملتے ہیں اردو زبان کی تاریخ کے طالب علم کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر شیخ نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ شیخ برہان الدین غریب دولت آباد میں سکونت پذیر ہوئے۔ وہ لوگوں سے ہندوی ہی میں گفتگو کرتے تھے جیسا کہ ان کے ملفوظات احسن الاقوال سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بہت سے ہندوی الفاظ ملتے ہیں جیسے کھٹ، کھچڑی، ڈولہ، چھجہ، اس کے علاوہ ہندوی اشعار بھی ملتے ہیں۔[19]

گجرات کے عالم بزرگ شیخ وجیہہ الدین علوی کے ملفوظات میں ان کے بولے ہوئے ہندوی کے جملے ملتے ہیں۔ مثلاً ایک دن کسی شخص نے شیخ سے کہا کہ شیخ فضل اللہ نے درس و تدریس کا کام بند کر دیا ہے۔ اس پر شیخ نے فرمایا: ''جب ترقی کریں گے اپن درس کہیں گے۔'' ایک شخص نے بتایا کہ شیخ کا فلاں مرید فلاں کام میں الجھ گیا ہے۔ جواب میں کہا: ''سب چھوڑ بیٹھے تو شتاب فائدہ ہوجاوے گا۔'' ایک دن ایک مرید کو بتایا کہ وہ فلاں کام کر بیٹھا تو اس کا ''تقویٰ چھوٹ جاتا۔''[20]

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اردو کی ترقی میں صوفیائے کرام کے رول پر بڑی دیدہ ریزی سے تحقیق کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ''دلوں کو ہاتھ میں لانے کے لیے سب سے پہلے ہم زبانی لازم ہے۔ ہم زبانی کے بعد ہم خیالی پیدا ہوتی ہے۔ درویش کا تکیہ (یعنی خانقاہ) سب کے لیے کھلا تھا۔ بلا امتیاز، ہر قوم و ملت کے لوگ ان کے پاس آتے اور ان کی زیارت اور صحبت کو موجب برکت سمجھتے۔ عام و خاص کی کوئی تفریق نہ تھی۔ خواص سے زیادہ عوام ان کی طرف جھکتے تھے۔ اس لیے تلقین کے لیے انھوں نے جہاں اور ڈھنگ اختیار کیے ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطے کی زبان سیکھیں تاکہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔''[21]

یہ بیان کسی حد تک صحیح ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ شیخ برہان الدین غریب یا سید محمد گیسودراز جن کے ملفوظات کے بابائے اردو نے حوالے دیے ہیں، وہ اپنی بولی یعنی دہلی کی ہندوی میں گفتگو کرتے تھے دکن اور گجرات کے علاقوں میں ہندوی بولنے والے دہلی سے آئے تھے۔ ان میں صوفیا بھی شامل تھے۔ صوفیا اپنی خانقاہوں میں زیادہ تر ہندوی میں گفتگو کرتے تھے۔ کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ گجرات یا دکن میں دہلی سے گئے ہوئے صوفیا نے کسی مقامی زبان کو سیکھا ہو۔ صوفیا کی اس بولی میں شاعری بھی اہمیت کی حامل ہے۔[22]

مختصراً یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے ارتقا کی تاریخ میں صوفیا کا حصہ بڑا اہم ہے۔ سماجی ہم آہنگی ہو یا ادبی تخلیق ہو دونوں کے بڑھانے میں صوفیا نے تاریخی اہمیت کا رول ادا کیا ہے۔

صوفیا کے اثر سے ہندوؤں میں بھکتی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک سے متعلق ہندوؤں نے ذات پات کے تصور کو ترک کیا اور رسم و رواج کو غیر اہم بتاتے ہوئے تمام انسانوں کی برابری کو تسلیم کیا۔ ان کے نزدیک محبت اور معبود حقیقی کی عبادت اور بندگی ہی ہر انسان کی نجات کا وسیلہ تھا۔ جنگل یا ویرانے میں رہنے کے بجائے وہ صوفیا کی طرح اپنے پیروؤں کے ساتھ رہ کر ان کی روحانی تربیت میں مصروف رہتے تھے۔ بہر حال بغیر مبالغے کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے کلچر کا مطالعہ بغیر صوفیا کے حوالے کے مکمل تصور نہیں کیا جا سکتا۔

حوالہ جات:

1. ملاحظہ کیجیے حسن سجزی، فوائد الفواد، (نول کشور پریس ص-35
2. امیر خسرو، اعجاز خسروی، جلد اول (نول کشور) ص 54-55

"(صوفیا کا اسلوب نگارش) دو قسم کا ہے۔ ایک سنجیدہ اور سلوک کے اعلیٰ مقامات والوں کا ہے دوسرا ان کا ہے جو جذب اور بیخودی سے متعلق ہیں۔ اہل تمکین (سنجیدہ) صوفیا کا اسلوب سلوک کی منازل کی اس طرح تشریح کرتا ہے کہ اگر سالک کا پیر کہیں کثافت کی دلدل میں پھنس جائے تو سچا رہنما اس طرح رہبری کرتا ہے کہ اپنا پیر دلدل سے نکال کر منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ کشف المحجوب اور سلوک المریدین اسی اسٹائل کی نشاندہی کرتی ہیں۔"

3. کشف المحجوب، مطبوعہ عالی امیر کبیر، ایران، 1339 شمسی، ص-46
4. اس کتاب کا فارسی ترجمہ تیرھویں صدی میں ہوا تھا جیسا کہ کتاب کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کا نادر مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ دیکھیے پروفیسر نذیر احمد کا انگریزی مقالہ:

The earliest known persian work on........ philosophy and Religion, Islamic Heritage in South - Asian subcontinent, ed N. Ahmed and Iqtidar H. Siddiqui, Jaipur 1998, Pp. 1-180

5. خراسان کے گیارھویں صدی عیسوی کے بزرگ شیخ ابوسعید ابوالخیر (م-1047) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ الٹے لٹک کر اس ورزش کو انجام دیتے تھے اور اس کے قانونی جواز کے لیے اس کو نماز مصطفےٰ بتاتے تھے۔ وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ ان کو اس عبادت سے سب سے زیادہ فیض حاصل ہوا ہے۔ دیکھیے۔ فوائد الفواد، ص-7
6. دیکھیے خلیق احمد نظامی، لائف اینڈ ٹائمس آف شیخ فریدالدین گنج شکر، ص 25 تا 26
7. فوائد الفواد، ص 84 تا 85
8. شعیب فردوسی، مناقب الاصفیہ، کلکتہ 1313ھ، ص 134، نیز خوان پر نعمت، انگریزی ترجمہ پال جیکسن، ص 57 تا
9. فوائد الفواد، ص 119
10. فوائد الفواد، ص 189
11. ایضاً، ص 202
12. ایضاً، ص 111 تا 112
13. فوائد الفواد، ص 195 تا 197
14. پال جیکسن کی انگریزی کتاب:

The way of a Sufi: Shaikh Sherafuddin Maneri (Idara-i-Adbiyat, Delhi, 1987) pp. 150-160

15. دیکھیے سید اطہر عباس رضوی، ہسٹری آف صوفی ازم ان انڈیا، جلد دوم، ص 101 تا 102
16. فوائد الفواد، ص 48
17. خیر المجالس، ص 185
18. شیخ جمالی، سیر العارفین، دہلی 1883، ص 67
19. نعمت اللہ ہروی، تاریخ خانجہاں لودی، مرتبہ امام الدین، ڈھاکہ 1960، جلد اول، ص 340
20. حماد بن عماد کاشانی، حسن الاقوال، مخطوطہ یونیورسٹی کلیکشن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، فارسیہ مذہب تصوف نمبر 318
21. شیخ محمد، ملفوظات شیخ وجیہہ الدین گجراتی، حبیب گنج کلکشن، فارسی مخطوطہ نمبر 221/21، اوراق، ب، الف، 10الف، 12الف، 13الف، 13ب وغیرہ
22. مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیا کرام کا کام، مطبوعہ یونین پریس، دہلی، ص 8

(بشکریہ "نوائے ادب" ممبئی)

□□□

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

یہ کتاب ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ملک و بیرون ملک کے سیمناروں میں پڑھے تھے۔ ان مقالوں میں انھوں نے تعلیمی عمل کو تدریسی اور تنظیمی دونوں نوعیتوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ دور میں تعلیمی، مادی، سماجی اور اخلاقی ترقی سے متعلق جتنی نئی نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں اسی قدر ہم میں ناآسودگی اور بے چینی بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ایسے میں محاسبے، تجزیے اور عمل میں کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے یہ کتاب ہماری ذہنی تربیت کرتی ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپے

انیس چشتی

موپلا ویگن ٹریجڈی

(جنگِ آزادی کا ایک بھولا بسرا باب)

1921 میں جب پورا بھارت ''سودیشی تحریک'' سے گونج رہا تھا، عین انھی دنوں میں کیرالا کے مسلمانوں کا ایک قبیلہ ''موپلا'' انگریزوں کے رونگٹے کھڑے کردینے والے وحشیانہ مظالم کا نشانہ بنا ہوا تھا۔

کیرالا یا ساحلِ مالابار سے اسلام کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے یعنی 711 سے بہت پہلے، اس ساحل پر اسلام کے قدم پڑ چکے تھے۔ جہاں تک ساحلِ مالابار کا تعلق ہے، تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں اسلام تاجروں کے ذریعے پہنچا، اور جہاں تک تجارت کا تعلق ہے وہ نبی کریمؐ کی بعثت سے پہلے بھی، عرب جہاز رانوں کے ذریعے اس ملک سے جاری تھی۔ خواجہ بہاء الدین اکری ندوی، مولانا سید سلیمان ندوی، حکیم عبدالحیٰ حسنی ندوی اس بات پر متفق ہیں کہ یہی عرب جہازراں جنوبی بھارت میں اسلام کے اولین تعارف کا ذریعہ بنے۔ یہ عرب تاجر یہاں سے ہاتھی دانت، صندل کی لکڑی، مور کے پر، املی، ریشم اور ململ، ناریل، ادرک، کافور، تلواریں، اچار، گرم مصالحہ اور اس میں بطور خاص سیاہ مرچ اسی ساحل سے عرب ملکوں کے راستے یورپ کے بازاروں تک لے جاتے تھے۔ کافور اور زنجبیل یہیں کے کپور اور ادرک یا سونٹھ کی عربی ہے۔ عربی زبان میں املی کے لیے ''تمر ہند'' یعنی ہندوستانی کھجور کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی لفظ یورپ جاکر Tamrind بن گیا۔ صندل دراصل چندن کی عربی ہے۔ کرن پھول'' قرنفل'' بن گیا اور نیلوپتل بمعنی کنول نیلوفر بن گیا۔

عرب جہازرانوں کے یہ قافلے گجرات میں سورت سے لے کر جنوب میں سراندیپ (سری لنکا) تک اترتے تھے، جس میں کیرالا کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں ان عرب تاجروں نے مقامی باشندوں سے شادی بیاہ کے ذریعے رشتہ داریاں بھی قائم کرلی تھیں اور ان کا اثر و رسوخ درباروں اور حکمرانوں تک بھی پہنچ چکا تھا۔ بلہارا نامی راجہ عربی زبان میں گفتگو کیا کرتا تھا اور مشہور ہے کہ اس نے اسلام بھی قبول کرلیا تھا۔ ان عرب تجار کا تعلق حجاز، عمان، بحرین، یمن اور حضر موت وغیرہ سے تھا، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ کیرالا کے اصل مسلم باشندوں (موپلا) کے آباواجداد عرب تھے۔ اللہ نے اس قبیلے کو بڑی برکت دی۔ آج بھی اس کی شاخیں کیرالا، سری لنکا، مالدیپ، تامل ناڈو اور انڈمان نکوبار میں پائی جاتی ہیں۔ مدراس میں چمڑے کا کاروبار کرنے والے ''لبّے'' اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

پورے بھارت کے ہندو سماج میں جس طرح ذات پات کا نظام رائج تھا، کیرالا کا یہ علاقہ بھی اس سے مستثنا نہیں رہا۔ برہمن اور پروہتوں کے بعد یہاں کا سب سے زیادہ قابلِ احترام طبقہ نمبودری اور نائروں کا تھا۔ یہاں کے اکثر حکمراں بھی ان کے ہمنوا تھے۔ نمبودری اور نائر زمیندار بھی تھے اور زمینداری دستور کے مطابق کاشتکاری کے لیے اپنی زمینیں نچلی ذات کے لوگوں کو دیتے تھے اور ان کی کڑی محنت کے بل بوتے پر عیش کی زندگی گزارتے تھے اور جب مرضی ہوتی انھیں بغیر کسی وجہ اور بغیر کچھ معاوضہ دیے زمینوں سے بے دخل بھی کردیا کرتے تھے۔ اس طرح سے محنت کش طبقے اور نائروں اور نمبودریوں کے درمیان ایک خاموش تنازعہ صدیوں سے چلا آتا تھا۔ اس سرسبز وادی میں جب اسلام کے قدم پہنچے تو اس نچلی ذات کے طبقے کو بھی اسلامی مساوات کا احساس ہوا اور انھوں نے دھڑا دھڑ اسلام قبول کرنا شروع کردیا اور غلامی کی زندگی سے ایک انگڑائی لے کر نجات حاصل کرلی۔ اسلام سے پہلے ان کی عورتیں صرف ایک دھوتی سے اپنا بدن ڈھکتی تھیں اور جسم کا اوپری حصہ برہنہ رہتا تھا۔ اسلام لانے کے بعد انھوں نے اسلامی شعائر کے مطابق پورے لباس سے اپنے ستر کو ڈھک لیا۔ اسی طرح ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوا کرتے تھے اور عورت کی موت کے بعد اس کی میراث بیٹوں کی بجائے اس کے بھانجے بھتیجوں میں تقسیم ہوا کرتی تھی۔ اسلام نے عورت کو اس جاہلانہ رسم سے نجات دلائی۔ چونکہ یہ طبقہ اپنے آپ کو پلا (Pilla) یعنی بیٹا (Son) کہتا تھا، اسلام میں داخلے کے بعد انھوں نے اپنے نام کے ساتھ مہا (Maha) یعنی عظیم کا لقب جوڑ لیا اور اب وہ Mahapilla یعنی معزز بیٹے کہلانے لگے، جس کا ملیالی تلفظ Mapilla ہے۔ اسی لفظ کو جب انگریزوں نے ادا کیا تو وہ جمع کے صیغے کے ساتھ Moplas بن گیا۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانکا میں وہ اسی تلفظ اور ہجے کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ آج بھی کیرالا میں موپلا مسلمانوں کا شمار پسماندہ ذاتوں (OBC) میں ہوتا ہے۔ ان کی اکثریت کالی کٹ (kozhicode) سے تقریباً 25 کلومیٹر جنوب میں ملاّ پورم اور شمالی کیرالا کے اضلاع کاسرگوڈ اور کنور میں آباد ہے۔

اسلام میں داخلے کے باوجود بھی ''پیشے'' کے اعتبار سے ان کی کوئی خاص

ترقی نہیں ہوئی۔ وہ بدستور نمبوودری اور نائر قبائل کی زیادتیوں کا شکار ہوتے رہے اور زمینوں سے بے دخل کیے جاتے رہے۔ ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی، جب ایک عظیم فاتح کی حیثیت سے کرناٹک کے افق سیاست پر ابھرے تو کیرالا کے انھی موپلوں نے انھیں کیرالا پر حملے کی دعوت دی۔ چنانچہ 1765 میں حیدر علی نے نائروں کو زیر کرنے کے لیے ان پر سمندری راستے سے حملے کا پلان بنایا اور منگلور میں جہاز سازی کا ایک زبردست مرکز قائم کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے کنانور، کالی کٹ، پونانی، یہاں تک کہ دور سمندر میں جہاں بحر عرب اور بحر ہند کی موجیں ملتی ہیں، جزائر مالدیپ پر اپنی فتح کے جھنڈے لہرادیے۔

حیدر علی کی اس یلغار سے موپلا مسلمانوں کو یک گونہ سکون ضرور ملا، لیکن ہندو مسلم منافرت کی دراڑ ان کے دلوں میں پڑ گئی اور یہی چنگاری ایک جوالا بن کر 1921 میں پھٹ پڑی۔ چونکہ مسلمانوں نے حیدر علی کا ساتھ دیا تھا، اس لیے مسلمانوں کے خلاف نائروں اور نمبوودریوں کی نفرت قدرتی تھی۔

1921 میں حسب روایتِ سابقہ موپلوں سے نائروں اور نمبوودریوں نے بغیر کوئی معاوضہ دیے اپنی زمینیں واپس چھین لیں اور موپلوں نے ان کے خلاف بغاوت کا اعلان کردیا۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے نمبوودریوں نے انگریزوں سے مدد طلب کی۔ چونکہ ہندو زمیندار تھے اور انگریز حکمراں، اس لیے انگریزوں نے نمبوودریوں کا ساتھ دیا۔ اس پورے علاقے میں انگریزوں نے مارشل لا نافذ کردیا اور مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے گورکھا رجمنٹ کو متعین کردیا۔

انگریزوں کے خلاف موپلوں کی بغاوت کی اور بھی کئی وجوہات تھیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد انگریزوں نے ترکی میں خلافت کا خاتمہ کردیا تھا۔ پورے بھارت میں آزادی کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے انگریزوں پر ترکی میں خلافت کے دوبارہ اجرا پر زور دیا۔ گاندھی جی نے بھارت میں ''خلافت تحریک'' کی بھرپور حمایت کی اور 17 اکتوبر 1919 کو بنائے گئے ''یوم خلافت'' کو ہندو مسلم اتحاد کے لیے استعمال کیا۔ کیرالا کا مسلمان بھی خلافت تحریک کا ایک سرگرم سپاہی تھا۔ وہاں اس تحریک کی قیادت علی مُسلیار کررہے تھے۔ ترورنگاڑی ان کی کارروائیوں کا مرکز تھا۔ انگریزوں نے علی مسلیار کی مسجد پر انھیں گرفتار کرنے کے لیے رات کے اندھیرے میں دھاوا بول دیا۔ اطراف کی تمام مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی۔ موپلا مسلمان، جنھوں نے اب تک عدمِ تشدد کا دامن نہیں چھوڑا تھا، اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور انھوں نے انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کردی۔ علی مسلیار کے ہزاروں چاہنے والے ترورنگاڑی میں اکٹھا ہونے لگے، کیونکہ انگریزوں کے کرتوتوں کی خبر پورے ملبار میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ انھوں نے انگریزوں کی فوج کو کالی کٹ لوٹنے پر مجبور کردیا۔ انگریز اس پسپائی سے چراغ پا تھے اور یہاں بھولے بھالے موپلا مسلمان یہ سمجھ بیٹھے کہ ملک سے انگریزوں کا خاتمہ ہو چکا ہے اور ''خلافت تحریک'' رنگ لائی ہے۔

اس دوران 26 اگست 1921 کو پوکوتور میں اور 14 نومبر 1921 کو پناڑک کاڑ میں انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف دو فیصلہ کن جنگیں لڑیں۔ انگریز جدید ہتھیاروں سے لیس تھے، جبکہ موپلوں کے پاس نہ تو فوجی تربیت تھی اور نہ ہی جدید ہتھیار تھے۔ ان جنگوں میں انگریزوں کا بہت کم، جبکہ موپلا مسلمانوں کا بھاری جانی نقصان ہوا۔ پہلی جنگ میں 300 تا 400 موپلا مارے گئے، جبکہ دوسری جنگ میں 234، موپلا مسلمان کام آئے۔ ان کی بہادر ٹکڑیاں گوریلا جنگ اختیار کرنے لگیں۔ انھوں نے اپنے 300 کلومیٹر علاقے کو تقریباً ایک مہینے تک سنبھالے رکھا۔ موپلا باغی اپنی حفاظت کے لیے درختوں پر چڑھ جاتے اور اپنے واحد ہتھیار Mallapuram Kathi یعنی ملاپورم کی بنی ایک بڑی آنکڑے دار چھری سے گورکھا اور انگریز سپاہیوں کی گردنیں اُچک لیتے۔ ایک ماہ کے مسلسل معرکے کے بعد موپلوں کو شکستِ فاش ہوئی۔ ان کا قتلِ عام ہوا۔ ہزاروں ہزار عورتوں کی عزت لوٹی گئی۔ بچوں تک کو تہہ تیغ کردیا گیا۔ تقریباً 122 مسلمانوں کو گرفتار کرکے اور ان پر نام نہاد مقدمہ چلانے کے لیے کیرالہ کے Tirur اسٹیشن پر کھڑی مال گاڑی کے منگلوری کھپریل (Tiles) لے جانے والی ایک خالی ویگن میں ٹھونس کر اس بوگی کا آہنی دروازہ باہر سے بند کردیا گیا اور اس ٹرین کو مدراس کے سیلم (Salem) اسٹیشن کے لیے روانہ کردیا گیا۔ گرمی کا موسم، ویگن میں گھپ اندھیرا، ہوا کے گزر کے لیے ایک سوراخ بھی نہیں۔ کھانے پینے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ آہنی پٹریوں پر رینگتی گویا ایک گرم فولادی قبر۔ تمیں افراد سے بھی کم گنجائش والی اس متحرک فولادی قبر میں ایک سو بائیس زندہ لاشیں ایک قیامت کے عالم سے گزر رہی تھیں۔ وہ اندھیرے میں زندہ رہنے کے لیے ایک دوسرے کو نوچ اور بھنبھوڑ ڈال رہے تھے۔ پیاس بجھانے کے لیے دوسروں کا خون اور اپنا پیشاب پیتے تھے۔ تین دن اور رات کے قیامت خیز سفر کے بعد ایک اسٹیشن پر جب دروازہ کھولا گیا تو دم گھٹنے اور کچلے جانے کی وجہ سے 65 مجاہدین کی لاشیں سڑاند پیدا کررہی تھیں اور جو زندہ بچے تھے ان کا پاگلوں سے زیادہ برا حال تھا۔

مدراس میں ان مجاہدین کے خلاف مقدمہ چلا۔ انگریزی سرکار نے کتنوں کو پھانسی کی سزا دی اور بہت سوں کو کالا پانی بھیج دیا گیا۔ اس ظالمانہ واقعے کی گونج اس وقت ساری دنیا میں سنی گئی۔

آج بھی انڈمان کے اکثر علاقوں میں ان شہیدوں کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ انڈمان میں ملیالم زبان کافی مقبول ہے۔ یہاں کے اکثر علاقوں

کے نام انھی جگہوں کے نام پر ہیں، جہاں سے یہ لوگ لائے گئے تھے۔ مثلاً ملاپورم، پوتی ہان گاڑی، پیرن تل منا (Perinthalmanna) وغیرہ وغیرہ۔ انڈمان کے گانوں میں مہاپلا پاٹو (Mahapla Pattu) ایک مشہور Vocal Art ہے، جو موپلا مسلمانوں کا قومی گانا ہے۔

اس پوری گوریلا بغاوت کی قیادت ویریَم کنّت کنجو محمد حاجی (Variam Kunnath Kunju Muhammad Haji) کررہے تھے۔ ویریَم کنّت ان کا خاندانی نام ہے، کنجو سے مراد چھوٹا یا صغیر ہے، یعنی صغیر محمد حاجی۔

کیرالا کی ریاستی حکومت، عصری تحقیقات کی روشنی میں موپلا مسلمانوں کی اس بغاوت کو انگریزوں کے خلاف لڑی گئی ایک جنگِ آزادی تسلیم کرچکی ہے۔ اکثر مؤرخین اسے قومی تحریک قرار دے چکے ہیں۔ اس بغاوت کی پچاسویں سالگرہ کے موقعے پر کیرالا کی ریاستی حکومت، 1971 میں اپنے ایک فیصلے کے تحت اس تحریک میں شریک مجاہدین کو "مجاہدینِ آزادی" (Freedom Fighters) کا درجہ دے چکی ہے اور ان کے متعلقین اور رشتہ داروں کو مجاہدینِ آزادی کو ملنے والی پنشن کا مستحق قرار دے چکی ہے۔ موپلا تحریکِ آزادی کے جن مجاہدین کو 1922 میں کالا پانی کی سزا سنائی گئی تھی ان کے نام اس طرح ہیں:

تیلیاپّی پرم بن علوی حاجی، کولاپرم بن کنج علوی، کوزی سیری کویا کٹی، امبانوپرم بن سعید الیپّا، کاپاک کاٹی پرم بل کنجے نی، ماچین گل راعین، کوتو کلان کناج را، چن گت اَتان، وے رَمَت وَلاپ پل احمد کٹی، مَتول احمد کٹی، پوپی کنان مَرک کار، محن چیری علوی، پوکٹ کویا ی، پوتم پی ڑی کایل کنجی قادر ملاّ، مقری کنجایتو، پولاک کوئیل گن ہی محی الدین کٹ ٹی، پوواگن دِل علوی، اَرپ راپوکر، مَتول مرک کر، چک کوٗ پورک کل کٹ ٹی حسن۔

یہاں ایک حیرت انگیز بات عرض کرتا چلوں کہ موپلا ویگن ٹریجڈی کے ضمن میں جب میں نے تحقیقی کام شروع کیا تو پتہ چلا کہ انسائیکلوپیڈیا برٹانکا کے نویں ایڈیشن 1875 کی اولین اشاعت میں تو موپلا مسلمانوں کا ذکر ہے، لیکن اس کے بعد شائع ہونے والے تازہ ترین انسائیکلوپیڈیا موپلا ویگن ٹریجڈی تو دور کی بات موپلا مسلمانوں کے تذکرے سے ہی خالی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ Macro اور Micro دونوں میں سے اس پوری تحریک کی تاریخ کو حذف کرنے کی سازش کی گئی ہے۔

کتابیات اور مراجع:

1. انسائیکلوپیڈیا برٹانکا-1875 نواں ایڈیشن
   Vol. IV pp 693
   Vol. VI pp 92
   Vol. XII pp 746
   Vol. XIV pp 183
   Vol. XV pp 185-187-312
2. انسائیکلوپیڈیا برٹانکا: اطلس اور نقشہ جات پر مشتمل جلد (نواں ایڈیشن)
3. India During Muslim Rule by Hakim Abdul Hai
4. Logan's Mannual-1932
5. Webstor's Encyclopedia
6. The Mapilla Muslims of Kerala by Ronald E. Miller
7. یادِ ایام از حکیم عبدالحیؒ
8. عرب و دیارِ ہند از خواجہ بہاء الدین اکرمی ندوی
9. عرب و ہند کے تعلقات از سید سلیمان ندوی
10. آرکائیوز، آل انڈیا ریڈیو اور انڈین نیوز
11. کیرالا کے مسلم دانشوروں سے ملاقاتیں اور نجی گفتگو۔

□□□

پتہ:
116, Sterling House, 1984,
Convent Street, Pune-411001

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا اپادھیائے / مترجم: احسان احمد صدیقی

رام پرشاد نے یہ آپ بیتی گورکھ پور جیل میں اپنی پھانسی 19 دسمبر 1927 کے دو دن قبل مکمل کی تھی۔ رام پرشاد بسمل کے سینے میں جو آگ تھی اور جو مقصد پیش نظر تھا اس کا خلاصہ انھوں نے اس آپ بیتی میں بیان کیا ہے جس میں ان کی اپنی مفلوک الحال خانگی زندگی، نامساعد ایام، ایام جوانی، ازدواجی زندگی، والدین اور مذہبی و سیاسی تعلیمات کے ساتھ اپنے اندر پیدا ہونے والے حب وطن کے جذبے کی وجوہات، کاکوری ریلوے ڈکیتی، اپنی گرفتاری، جیل کے واقعات، پھانسی کی کوٹھری اور زندگی کے آخری لمحات کی باتیں بڑی دل خراش ہیں۔

صفحات: 109، قیمت-/33 روپے

شیریں زباں خانم

ریشمی رومال کی تحریک: آغاز وانجام

ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد اقتدار پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ 1803 میں ایسٹ انڈیا کمپنی ملک پر اپنا اقتدار قائم کر چکی تھی۔ کمپنی کے نمائندوں نے مرکزی حکومت سے ملکی انتظامات کے حقوق کا پروانہ حاصل کرلیا تھا۔ یہ پروانہ بالجبر لکھوایا گیا تھا جس کے تحت یہ اعلان کیا گیا ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا۔''

دہلی، سندھ، مدراس، بنگال، میسور، دکن، روہیل کھنڈ اور یوپی کے صوبوں پر انگریزوں کی عمل داری تھی۔ صوبہ سرحد، کشمیر اور پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حکومت تھی جو کمپنی کے ساتھ تعاون کے معاہدوں میں بندھی تھی۔ اس پس منظر میں خاندان ولی اللہ کے وارث مولانا شاہ عبدالعزیزؒ نے آزادی وطن کی تحریک کا آغاز کیا اور اپنے مریدوں اور رفیقوں کی ایک جماعت تیار کی۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ مرکز میں رہ کر انگریزوں کے خلاف جنگ ممکن نہیں۔ اس لیے شمال مغربی صوبہ سرحد کو محاذ جنگ کے طور پر چنا گیا اور اندرون ملک سے مالی اور فوجی امداد کے لیے سندھ، کوئٹہ اور بلوچستان کو محفوظ راستے کے طور پر متعین کیا گیا۔ کوہستانی قبائل اور افغانی حکومت سے مالی اور فوجی تعاون کا منصوبہ بنایا گیا۔ شاہ عبدالعزیز نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔ اپنے رفیقوں اور مریدوں کو ملک اور بیرون ملک کے دور دراز علاقوں میں تبلیغ جہاد پر مامور کیا۔ لیکن کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنے سے قبل ہی آپ کی رحلت ہوگئی۔

آپ کے انتقال کے بعد آپ کے شاگرد اور خلیفہ سید احمد بریلوی نے چھ سال تک صوبۂ سرحد میں اس تحریک کو مستحکم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہاں سکھوں کی حکومت انگریزوں کی طرفدار تھی۔ 1831 میں بالاکوٹ کے مقام پر شیر سنگھ سے جنگ کرتے ہوئے سید احمد بریلوی اور مولانا محمد اسماعیل شہید ہوگئے اور یہ تحریک جو تاریخ میں وہابی تحریک سے موسوم ہے، بظاہر کمزور پڑ گئی۔

سید احمد بریلوی کی شہادت کے بعد ان کے رفقا کچھ دنوں تک مایوسی وبددلی کا شکار رہے لیکن بعد میں شیخ محمد ولی پھلتی، نصیرالدین منگلوری، نصیرالدین دہلوی (شاہ عبدالعزیز کے پوتے اور جانشین) نے یکے بعد دیگرے قیادت سنبھالی اور وہابی تحریک نشیب وفراز سے گزرتی رہی۔ اخیر میں تحریک کے عظیم آبادی خلفا ولایت علی اور عنایت علی دونوں بھائیوں نے باگ ڈور سنبھالی اور اس تحریک کو ملک گیر تحریک آزادی بنادیا جس کا تفصیلی ذکر ڈبلو ڈبلو ہنٹر کی کتاب "Our Indian Musalman" میں موجود ہے، لیکن یہ ایک الگ داستان ہے۔

''وہابی تحریک'' آزادی وطن کی سب سے پہلی منظم تحریک تھی جس میں مسلمانوں نے بے دریغ قربانیاں دیں۔ اگر چہ یہ تحریک حصول مقصد میں ناکام رہی لیکن اس نے دور رس اثرات مرتب کیے۔ 1857 کی جنگ آزادی اسی تحریک کا فطری نتیجہ تھی۔ اس کے علاوہ ملک کی آزادی کے لیے جو مختلف تحریکیں وقتاً فوقتاً شروع ہوئیں وہ سب کی سب اس تحریک سے کسی نہ کسی سطح پر متاثر تھیں جن میں ایک تحریک حاجی شریعت اللہ کی ''فرائضی تحریک'' ہے۔

سید احمد شہید بریلوی کی ''وہابی تحریک'' سے ملتی جلتی بنگال کی فرائضی تحریک کی بنیاد 1802 میں حاجی شریعت اللہ نے رکھی تھی جس کا مقصد معاشرے میں مذہبی فرائض کی پابندی کو مرکزی اہمیت دینا تھا۔ آگے چل کر جب سید احمد شہید بریلوی کی تحریک (بریلوی تحریک) کا آغاز ہوا تو فرائضی تحریک سے وابستہ ذمے داروں کا تعلق بھی اس تحریک سے ہوگیا جس کی تفصیل وہابی تحریک کی تاریخ میں موجود ہے۔ اس تحریک میں رسوم باطلہ کے خلاف معاشرتی اصلاح کا پہلو نمایاں تھا۔

1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سب سے اہم تحریک ''ریشمی رومال کی تحریک'' ہے جو بے حد منظم تھی اور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جنگی نقشوں کی تیاری کے علاوہ دشمن کی جاسوسی پر خصوصی توجہ دی گئی تھی اور دشمن کے دیسی فوجیوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی بھی کوشش تھی۔ ان تینوں امور کی انجام دہی کے لیے الگ الگ مجاہدین مقرر کیے گئے تھے۔

جنگی نقشوں کی تیاری کے لیے مولانا عبید اللہ سندھی پر نظر انتخاب پڑی تھی۔ تحریک کی مرکزی شخصیت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ تھے۔ عبید اللہ سندھی کے معاون شیخ محمد ابراہیم تھے جو ممبئی کے رہنے والے تھے اور اقتصادیات میں ایم اے۔ تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے سات سال کی تگ ودو کے بعد جنگ کا مکمل نقشہ تیار کرلیا۔

انھوں نے فنون حرب پر اتنا عبور حاصل کرلیا تھا کہ افغان انگریز جنگ میں میر امان اللہ خاں ان سے مشورے لیتا تھا۔ مولانا سندھی لکھتے ہیں:

''ہم نے جنگی قواعد کے مطابق ہر راستے کے نشیب وفراز محاذ کی پشت

پناہی و پیش بینی، حملہ آور فوج اور باغی رضا کاروں کے باہمی روابط و تعاون اور رسد رسانی اور پیغام رسانی کے راستوں کے مواقع وغیرہ کی اس نقشۂ جنگ میں تفصیل درج کی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ قدیم اصولِ جنگ اور جدید قواعد حرب سے ہم بخوبی واقف تھے۔'' (تحریک ریشمی رومال۔ ص 148-149)

دشمن کی فوجوں میں بھی مجاہدین کو بھرتی کرا دیا گیا تھا جو فوجیوں کو اپنا ہم خیال بھی بناتے تھے اور دشمن کی فوجی سرگرمیوں کی اطلاع بھی قائدین تک پہنچاتے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ گرفتار بھی ہوئے اور کچھ لوگوں نے جنگ کے خاتمے کے بعد اپنے نام فوج سے کٹوا لیے۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور سکھ اور ہندو بھی۔ بعد میں ان میں سے بہت سے لوگ آزاد ہند فوج میں شامل ہو گئے۔

جنگ کے نقشے میں اندرون ملک بغاوت کے مراکز کا قیام بھی عمل میں آیا تھا جس کے تحت رضا کاروں کی بھرتی، عوامی جذبۂ انقلاب کو بیدار کرنا اور متحد رکھنا ضروری تھا۔ اس مقصد کے لیے ملک بھر میں آٹھ شاخیں قائم کی گئی تھیں۔ ہیڈ کوارٹر دہلی میں تھا۔ دیگر مراکز راندیر، سورت، گجرات، ممبئی کا مرکز تھا۔ پانی پت، یوپی کا مرکز تھا۔ لاہور پنجاب کا مرکز تھا۔ دین پور ریاست بہاولپور کا مرکز تھا۔ امروٹ۔ سندھ کا مرکز، کراچی۔ کراچی او رفلات اور لس بیلا، اتمان زئی، صوبۂ سرحد کا شمالی مرکز، ترنگ زئی، آزاد قبائل کا مرکز تھا۔ اس کے علاوہ بھی آسام اور بنگال میں کئی مراکز تھے جن کی تفصیل دستیاب نہیں۔

ریشمی رومال کی تحریک کے قائدین نے 19 فروری 1915 اندرونی بغاوت اور بیرونی حملے کی تاریخ مقرر کی تھی۔ اس تاریخ کا تعین دہلی کے مرکزی دفتر نے حضرت شیخ الہند کی موجودگی میں کر دیا تھا جس کے بعد آپ سفر حج پر روانہ ہوئے۔ اس تاریخ کی اطلاع تمام شاخوں کو دے دی گئی تھی۔ پروگرام کے مطابق ہر شاخ متحرک تھی اور سارے کام بہ حسن وخوبی انجام پذیر ہو رہے تھے۔

قائدین نے بیرون ملک بھی امدادی مرکز قائم کیے تھے جن کا مقصد مال اور اسلحہ کی فراہمی اور رضا کاروں کی بھرتی تھا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر کابل (افغانستان) میں تھا جہاں راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا سندھی دونوں مل کر کام کرتے تھے۔ اس کی پانچ شاخیں تھیں۔ مدینہ منورہ، استنبول، قسطنطنیہ، انقرہ، برلن۔

برلن کے انچارج ہر دیال صاحب تھے جن کی کوشش سے جرمن حکومت ہندوستانیوں کی مدد کے لیے آمادہ ہوئی اور اس نے وعدہ کیا کہ ہندوستان کو انگریزوں سے نجات دلا کر جرمن فوج واپس ہو جائے گی۔ افغانستان میں اس تحریک کو توقع سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ فیصلہ یہ کیا گیا تھا کہ ترکی افغانستان کے راستے 19 فروری 1915 کو ہندوستان پر حملہ کرے گا اور اسی دن ہندوستان کے اندرونی محاذوں پر بغاوت ہو جائے گی اور انگریزوں کی فوج کو ہر طرح کا نقصان پہنچایا جائے گا۔ اس تاریخ کے تعین کے بعد آخری فیصلہ افغان حکومت سے معاہدے پر مبنی تھا جس کے مطابق ترکی حکومت سے گفتگو کے بعد اس کو آخری شکل دینا تھا اور یکم جنوری 1915 کو کابل ہیڈ کوارٹر تک اطلاع بھجوائی تھی جہاں سے دہلی کو آخری فیصلے کی خبر دی جانی تھی۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے حجاز کے گورنر غالب پاشا سے دو خط لکھوائے جن میں پرانے معاہدوں کی توثیق تھی۔ افغان حکومت کو لکھا گیا تھا کہ مولانا محمود الحسن آفندی (شیخ الہندؒ) تمھارے پاس آ رہے ہیں، یہ ہماری حکومت کے ایما پر تم سے گفتگو کریں گے۔ ان کی باتوں کی تائید ہماری حکومت کرتی ہے اور ان کے معاہدوں کو ترک حکومت کا معاہدہ سمجھا جائے۔ یہ خط ''عہد نامہ غالب'' سے موسوم ہے۔

دوسرا خط'' غالب نامہ'' جس میں جہاد کے لیے ترغیب دی گئی تھی جس کو طبع کرا کر ہندوستان اور افغانی قبائل میں تقسیم کروانا تھا۔

تحریک کی ناکامی کے بعد'' غالب نامہ'' انگریزوں کو مل گیا تھا۔ لیکن'' عہد نامۂ غالب'' نہیں مل سکا۔ یہ خط آج تک عدم دستیاب ہے۔ ان خطوط کے علاوہ شیخ الہند نے انور پاشا اور جمال پاشا سے دو خطوط لکھوائے تھے جن کو الگ الگ معاہدوں کی حیثیت حاصل تھی۔ ایک خط تو ترکی حکومت اور ہندوستان کی حکومت کے درمیان تھا جو انقلابی پارٹی نے قائم کی تھی اور جس کو ایک طرح کی عبوری حکومت سمجھنا چاہیے۔ اس خط کو انقلابی ترکی معاہدہ قرار دیا گیا۔

دوسرا خط ترکی حکومت اور افغان حکومت کے درمیان تھا۔ انقلاب کی تاریخ کا تعین اسی خط میں تھا۔ یہ دراصل ترکی افغان معاہدہ تھا۔ یہ دو خطوط دو عہد ناموں کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے مجموعے کو'' انور نامہ'' سے موسوم کیا گیا۔

ہندوستان کی جلاوطن انقلابی حکومت کے صدر شیخ الہند مولانا محمود الحسن تھے اور جمہوریہ ترکیہ کے صدر انور پاشا تھے۔

چونکہ اب تک کی ساری باتیں انقلابی حکومت اور ترکی حکومت کے نمائندوں کے توسط سے ہوئی تھی، اس لیے ضرورت تھی کہ ترکی افسروں اور انقلابی حکومت کے ذمے داروں کے درمیان براہ راست گفتگو کے بعد معاہدے کو آخری شکل دی جائے تا کہ کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہ جائے۔ معاہدے کی رو سے ترکی حکومت کی فوجیں ہندوستان کو فتح کر کے انقلابی حکومت کے خلاف رضا کاروں اور مالی تعاون سے انقلابی حکومت ترکی حکومت کے ساتھ رہے گی۔ اس مفہوم کا ایک وثیقہ مجلس شوریٰ نے مع دستخط شیخ الہند کے حوالے کیا تا کہ وہ خود صدر جمہوریہ ترکی انور پاشا سے گفتگو کریں۔

شیخ الہند نے سفر حج کا ارادہ کیا اور اپنی جائداد شرعی احکام کے مطابق تقسیم کر دی۔ چونکہ اس وقت حجاز میں ترکی حکومت تھی اس لیے وہاں سے صدر جمہوریہ ترکی سے ملاقات میں آسانی تھی جن سے منظوری کے بعد انھیں کابل لوٹنا

تھا اور وہاں سے آخری مقصد کی تکمیل کے لیے اقدام کرنا تھا۔

جب یہ سارے معاملات طے پا گئے تو اس پورے معاہدے کو ایک ریشمی رومال پر لکھوایا گیا جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

''حضرت سندھی اور نصر اللہ خاں نے مل کر ایک ماہر کاریگر سے ایک ریشمی رومال اس طرح بنوایا کہ اس کی بناوٹ میں معاہدہ کی پوری عبارت بھی بُن دی گئی۔ یہ عبارت عربی زبان میں تھی اور دستخط حبیب اللہ اور اس کے تینوں بیٹوں امان اللہ، نصر اللہ اور عنایت اللہ کے ایک دفعہ تو بُننے میں آ گئے تھے اور پھر اس رومال کے اوپر ان چاروں کے دستخط زرد رنگ کی سیاہی سے کروائے گئے تھے۔ یہ رومال بھی زرد رنگ کا تھا جس کی لمبائی ایک گز تھی اور عرض بھی اتنا ہی تھا۔''

(تحریک ریشمی رومال۔ ص 201)

ریشمی رومال پر لکھے ہوئے اس معاہدے کی خبر انگریزوں کو ہو گئی۔ خبر دینے والوں میں خود میر حبیب اللہ خاں اور اس کے لڑکے عنایت اللہ خاں تھے۔ جنھوں نے ساری تفصیلات اور مختلف مقامات کے پتے لاکی کے ذریعے انگریزوں تک پہنچا دیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر ریشمی رومال پکڑا گیا اور تحریک سے وابستہ بہت سے کارکن گرفتار ہو گئے۔

انگریزوں کو یہ رومال شیخ عبدالرحیم سے ملا۔ شیخ عبدالرحیم مسٹر کرپلانی کا حقیقی بھائی تھا۔ اس نے مولانا سندھی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور مشرف بہ اسلام تھا۔ شیخ عبدالرحیم اسلامی نام تھا۔ وہ اس رومال کو عشا کے وقت ایک گدڑی میں سی رہے تھے کہ فوج دیوار پھاند کر اندر آ گئی۔ انھوں نے حلیہ بدل لیا تھا اور روپوشی کی تیاری کر لی تھی کہ فوج نے رومال پر قبضہ کر لیا۔ یہ بھی اس افراتفری میں دیوار پھاند کر فرار ہو گئے اور ایسے فرار ہوئے کہ پھر ان کا کوئی پتہ نہ ملا۔ بعض قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ روس چلے گئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان ہی میں فقیری کی حالت میں باقی دن بسر کی اور سرحد میں انتقال کیا۔ روپوش اس لیے رہے کہ گرفتاری کے بعد تشدد کا خطرہ تھا اور یہ خدشہ کہ تشدد کی تاب نہ لاکر ممکن ہے سارے راز افشا کر دیں اور ان بزرگوں پر آفت آئے جو اس تحریک سے وابستہ تھے۔

افغانستان سے یہ رومال ایک نومسلم نوجوان شیخ عبدالحق کے ذریعے پشاور پہنچا۔ شیخ عبدالحق بنارس کے ایک رئیس ہندو گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، انگریزی میں ایم.اے. تھے۔ کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد شیخ الہند سے بیعت ہو گئے تھے اور پیغام رسانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کو ہدایت تھی کہ حیدرآباد سندھ جا کر رومال شیخ عبدالرحیم کے حوالے کریں، یہ رومال لے کر حج کے لیے مکہ جائیں گے اور شیخ الہند کو یہ رومال سونپ دیں گے۔ اگر وہ کوئی خطرہ محسوس کریں تو یہ رومال خاں بہادر حق نواز کو ساری ہدایات کے ساتھ سونپ دیں۔

بعض اسباب کی بنا پر عبدالحق نے یہ رومال حق نواز خاں کے حوالے کیا۔ رات کے نو بجے رومال حق نواز کو ملا۔ ان کا ایک معتبر آدمی صبح چار بجے یہ رومال ریاست بہاول پور کے سجادہ نشیں خواجہ غلام محمد کو دے دیتا ہے۔ پشاور میں نماز صبح سے قبل حق نواز کے مکان پر فوجی چھاپہ پڑتا ہے لیکن اصل چیز نکل چکی تھی۔

خواجہ غلام محمد کو یہ رومال دوسرے دن دس بجے ملتا ہے۔ بارہ بجے وہ ایک معتبر قاصد کے ساتھ اسے سندھ روانہ کر دیتے ہیں۔ شام کے چار بجے ان کے گھر کا محاصرہ ہو جاتا ہے۔ ان کی خانہ تلاشی ہوئی لیکن وہ پوچھ گچھ میں بھی ثابت قدم رہے۔ دوسرے دن ظہر کے وقت یہ رومال شیخ عبدالرحیم کو ملا اور اسی دن جب وہ روپوشی کی تیاری کر رہے تھے کہ عشا کے وقت انگریز فوج نے چھاپہ مارا اور اس رومال کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس طرح پوری تحریک ناکام ہو گئی اور طرح طرح کے مسائل ترکی اور افغانستان میں پیدا ہوئے۔

شیخ الہند مع رفقا کے گرفتار کیے گئے۔ مصر کی عدالت میں مقدمہ چلا۔ عدالتی کاروائی کے درمیان یہ حقیقت سامنے آئی کہ ان کی خاص مجلسوں کے حالات سے بھی انگریز واقف تھے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی خاص محفلوں میں بھی انگریزوں کے جاسوس موجود تھے جن میں سے بعض کی نشاندہی بھی ہو گئی ہے۔ ان خصوصی محفلوں کے شرکا میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد، گاندھی جی، موتی لال نہرو، راجہ مہندر پرتاپ، مولانا برکت اللہ، ہردیال صاحب، مولانا سندھی، مولانا ہادی حسن، مولانا محمد میاں انصاری اور مولانا عزیز گل کے نام تھے۔ بعض اندرونی شہادتوں کی بنا پر مولانا عزیز گل کو انگریزوں کا جاسوس قرار دیا گیا لیکن بعض ذمے داروں نے اس کی تردید کر دی۔ شیخ الہند اور مولانا احمد حسن مدنی جزیرۂ مالٹا میں قید کیے گئے۔ قید میں مولانا عزیز گل بھی ان کے ساتھ تھے۔ جزیرۂ مالٹا میں ان تین قیدیوں کے درمیان ہونے والی باتیں بھی انگریزوں کو پہنچتی رہتی تھیں۔ اسی بنیاد پر مولانا عبدالرحمن نے مولانا عزیز گل کو شک کے دائرے میں رکھا تھا جس کی تردید مولانا اسعد مدنی نے پرزور الفاظ میں کر دی ہے۔

ریشمی رومال کی تحریک آزادی کی ایک بے حد اہم تحریک تھی۔ اس تحریک کے نتیجے میں ہزاروں علما قید و بند اور شہادت کی سخت منزلوں سے گزرے اور بے شمار ہندو و سکھ کارکنان مصیبتوں کے شکار ہوئے لیکن اس بے حد منظم تحریک نے آزادی کے کارواں کو تیز تر کرنے میں کلیدی رول ادا کیا۔

□□□

ابرار رحمانی

حفیظ بنارسی — شاعر اور نثر نگار

کسی شاعر کی مقبولیت اور پذیرائی کا راز اس میں مضمر ہے کہ وہ کس قدر اپنے دلی جذبات واحساسات کی ترجمانی اور عہد حاضر کے مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔ فن کار کا تخلیقی شعور اس وقت اپنی بلندیوں پر ہوتا ہے جب وہ ان اوصاف سے متصف ہو۔ حفیظ بنارسی ایک ایسے ادیب و شاعر ہیں، جنھوں نے اپنی تخلیقات میں اپنے احساسات و جذبات اور اپنے عہد کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ ان کی شاعری کا اختصاص یہ ہے کہ ان کے افکار وخیالات میں پیچیدگی یا لفظی ثقل کا کہیں کوئی دخل نہیں۔ وہ عام فہم، سبک اور سلیس اسلوب میں شاعری کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے جذبات اور احساسات کو پورے خلوص کے ساتھ شعری پیکر عطا کیا ہے جو عوام کو اپنے دل کی آواز محسوس ہوتے ہیں۔ وہ شاعری کو زندگی سے علاحدہ شے نہیں سمجھتے چنانچہ اپنے مجموعے ''درخشاں'' (1969) میں رقم طراز ہیں:

''میں شاعری کو زندگی سے الگ چیز نہیں سمجھتا۔ دونوں میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ میں ادب برائے ادب سے زیادہ ادب برائے زندگی اور ادب برائے انسانیت کا قائل ہوں۔ میری نظر میں شاعری تنقید حیات بھی ہے اور تہذیب حیات بھی۔ یہ زندگی کی ترجمانی و عکاسی بھی کرتی ہے اور اس کی تہذیب و تزئین بھی۔ شاعر کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں۔ وہ عام انسانوں سے زیادہ حساس اور باشعور ہوتا ہے اور اس کی سماجی ذمے داریاں بھی اوروں سے زائد ہوتی ہیں۔''

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ شاعر کسی طلسماتی یا جادوئی چھڑی کا استعمال نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے احساسات و جذبات اور گردوپیش کے حالات کو شعری پیرائے میں پیش کردیتا ہے۔ حفیظ بنارسی کے کلام کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے تعلق سے جو دعویٰ کیا ہے، وہ صحیح ہے۔ ملاحظہ ہوں ان کے چند اشعار:

تاروں کی روشنی شب غم میں نہیں تو کیا
ہم آنسوؤں کے دیپ جلائے ہوئے تو ہیں
روشن جبینِ دوست ہے مہتاب کی طرح
چہرہ شگفتہ ہے گُلِ شاداب کی طرح
اب آ بھی جایئے کہ غم انتظار میں
دل مضطرب ہے ماہیِ بے آب کی طرح
جب تصور میں کوئی ماہ جبیں ہوتا ہے
رات ہوتی ہے مگر دن کا یقیں ہوتا ہے

حفیظ بنارسی کی شاعری میں جذبہ وشعور کی لہروں کے ساتھ گردوپیش کے حالات کا جابجا ذکر ملتا ہے۔ غزل ان کی محبوب صنف ہے لیکن نظموں میں بھی ان کی دلچسپی کم نہیں بلکہ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز نظم گوئی سے ہی کیا۔ چنانچہ اپنے مجموعے ''قول وقسم'' کے پیش لفظ میں جو نظموں پر مشتمل ہے اور 1975 میں شائع ہوا، لکھتے ہیں:

''غزل میری محبوب صنف ہے اور بہت حد تک میری شہرت اور مقبولیت کا باعث بھی مگر نظموں سے بھی میری دلچسپی کچھ کم نہیں۔ جو لوگ مجھ سے اور میری شاعری سے واقف ہیں، انھیں اس بات کا بخوبی علم ہوگا کہ میں نے مختلف دور میں مختلف عنوانات پر کافی تعداد میں نظمیں کہی ہیں، جنھوں نے مجھے جلسوں اور مشاعروں میں سنا ہے، وہ بھی اس حقیقت کے شاہد ہوں گے۔ یہاں اس حقیقت کا بھی انکشاف کردوں کہ میں نے اپنی شاعری کا آغاز دراصل نظم گوئی سے ہی کیا تھا۔''

''قول وقسم'' میں یوم جمہوریہ، ترانۂ کشمیر، اے ہند کے سپاہی، عزم جواں، فرقہ پرستی کے خلاف اور ساز جمہور کے علاوہ بہت سی نظمیں ایسی ہیں، جن کی معنویت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ پہلے تھی۔ ان کی نظم ''یوم جمہوریہ'' کے چند اشعار ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ ان میں کس قدر شگفتگی اور روانی پائی جاتی ہے:

آج وہ دن ہے کہ جمہور کی عظمت جاگی
آج وہ دن ہے کہ بھارت سے غلامی بھاگی
آج ہی سے نئے آئین کا آغاز ہوا
آج کے دن ہی مساوات کا در باز ہوا
نغمۂ حبِ وطن جھوم کے گائیں آؤ
جشنِ جمہور بصد شوق منائیں آؤ

فرقہ پرستی ایسا زہر ہے جو دیمک کی طرح قوم کو اندر ہی اندر چاٹ جاتا ہے۔ ادبا وشعرا نے ہر دور میں اس کے خلاف آواز بلند کی ہے اور قومی یکجہتی کی فضا ہموار کرنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی قندیلیں روشن کی ہیں۔ حفیظ بنارسی نے نظم ''فرقہ پرستی کے خلاف'' میں کھل کر فرقہ پرستوں کے خلاف علم آواز بلند کی ہے:

یہ ملک اپنا
جو مختلف رنگ وبو کے پھولوں کا اک حیات آفریں چمن ہے
جہاں ہے کثرت میں حسنِ وحدت
جہاں ہے نیرنگیِ نظارہ
جہاں درختوں پہ مست ہوکر ہزاروں پنچھی چہک رہے ہیں

الگ الگ بولیوں میں اپنے دلوں کے جذبات اگل رہے ہیں
اٹھے ہیں کچھ سر پھرے یہاں پر
کہ اس کی تصویر کو بدل دیں
جو روح اس میں رواں دواں ہے
بزور شمشیر اسے کچل دیں
انھیں یہ ضد ہے کہ اس چمن میں
بس ایک ہی پھول مسکرائے
انھیں یہ ضد ہے کہ گوشے گوشے میں اس حیات آفریں چمن کے
بس ایک ہی مرغ چہچہائے
بس ایک نغمہ فروغ پائے
وطن پرستو، چمن پرستو!
چمن کے حق میں
بڑا ہی منحوس ہوگا وہ دن
جب اپنی ناپاک کوششوں میں
یہ سر پھرے کامیاب ہوں گے
ملی اگر ان کو کامیابی
تو پھر یہ اپنا عظیم بھارت، جہاں ہے کثرت میں حسنِ وحدت
چمن نہ ہوگا، کچھ اور ہوگا
نشانِ فرقہ پرستی تم کو جہاں بھی آئے نظر مٹا دو
وطن کو جنت نشاں بنا دو

آج ملک میں چاروں طرف بے چینی اور بدامنی ہے، خلفشار ہے، ایک فرقے کے خلاف نفرت کی فضا بنائی جا رہی ہے، ایسے میں حفیظ بنارسی کی نظم کا یہ بند دعوت عمل دیتا ہے:

وطن پرستو چمن پرستو!
میں تم کو آواز دے رہا ہوں
اٹھو وقارِ وطن کی خاطر
اٹھو بہارِ چمن کی خاطر
نشانِ فرقہ پرستی تم کو جہاں بھی آئے نظر مٹا دو
وطن کو جنت نشاں بنا دو

حفیظ بنارسی نے اپنے "قول و قسم" کے دیباچے میں تحریر کیا ہے: "تاریخ وطن میں ایک دور ایسا بھی آیا، جب بہت سے مسلمانوں کو اپنا مستقبل یہاں تاریک نظر آیا۔ چنانچہ بہت سے تعلیم یافتہ مسلم نوجوان بہتر ملازمت اور عہدوں کی طمع میں اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر پاکستان چلے گئے۔ میرے بھی کچھ ہم سبق اور ہم جماعت وہاں جا کر اچھی جگہوں پر مامور ہو گئے اور انھوں نے مجھے بھی دعوت دی کہ یہاں چلے آؤ، تمھارے لیے بڑے اچھے مواقع ہیں مگر شیخ علی حزیں کی طرح مجھے بھی بنارس اور سرزمین ہند کو چھوڑنا منظور نہ ہوا۔ مجھے خاکِ وطن عزیز رہی اور الحمدللہ میں یہاں رہ کر خوش ہوں۔" نظم "نذر وطن" انھوں نے حب الوطنی کے اسی جذبے سے سرشار ہو کر کہی:

دیارِ لالہ و سرو و سمن سلام تجھے
حریمِ لیلیٰ شعر و سخن سلام تجھے
مہ و نجوم کی بزمِ کہن سلام تجھے
سلام وادیِ گنگ و جمن سلام تجھے
مرے وطن مرے پیارے وطن سلام تجھے

"اے وطن تجھ پہ قربان ہو جائیں گے ہم" (چین کے حملے پر) ان کی حب الوطنی کا اعلان نامہ ہے:

زور بازو کا اپنے دکھائیں گے ہم
دھجیاں دشمنوں کی اڑائیں گے ہم
جنم بھومی کی شوبھا بڑھائیں گے ہم
گولیاں کھا کے بھی مسکرائیں گے ہم
اے وطن تجھ پہ قربان جائیں گے ہم

حفیظ بنارسی قومی یکجہتی اور اتحاد و اتفاق کے زبردست مبلغ ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ اس کے بغیر ملک کی ترقی اور استحکام ممکن ہی نہیں۔ ان کے نزدیک اتحاد وہ عظیم قوت ہے، جس کی بدولت دشمنوں کی چالبازیوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ باہمی اتحاد کی اہمیت کو نظرانداز کر کے ترقی کا خواب دیکھنا بے معنی ہے۔ جدید اردو شاعری کے معمار الطاف حسین حالی نے بھی اتفاق و اتحاد کی اہمیت سمجھاتے ہوئے بیباکانہ اعلان کیا تھا کہ جس قوم میں اتحاد و اتفاق نہ ہو، اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں:

پھوٹ ہے جس قوم میں وہ قوم کیا
حق میں ہے اس قوم کے بہتر فنا

حفیظ بنارسی نے اپنی نظم "ترانۂ یکجہتی" میں اتحاد و یک جہتی کا درس دیتے ہوئے کہا:

آپس کے اتحاد میں پنہاں ترقیاں
آپس کے اتحاد میں ہیں سربلندیاں
آپس کا اتحاد علاجِ غمِ جہاں
آپس کا اتحاد بڑھاتے چلے چلو

جیسا کہ حفیظ بنارسی نے خود کہا ہے کہ "غزل ان کی محبوب صنف ہے۔ غزل کا دامن حسنِ سخن کے گلہائے رنگارنگ سے معمور ہے۔ جمالیات ہو یا اخلاقیات، تصوف کے دقیق نکتے ہوں یا فلسفہ وحکمت کی موشگافیاں، عرفانِ ذات ہو یا آگہیِ کائنات، مسائلِ حق کی گفتگو ہو یا رازِ درونِ میخانہ، غزل کا دامن ہر طرح کے مضامین سے مزین اور مالا مال ہے۔ غزل وہ آئینۂ صد رنگ

ہے، جس میں ہمارے دلی جذبات و احساسات کی تصویر بھی نظر آتی ہے اور حیات وکائنات کی تفسیر دل پذیر بھی۔"

ان کے مجموعے "غزالاں" کے مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں جب ہم ان کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ان میں بلا کی روانی اور کیف وسرور پیدا کرنے کی طاقت ہے۔ انھوں نے محبوب کے حسن وادا اور کشاکش حیات کی جو عکاسی کی ہے، وہ عشقیہ شاعری کا خوبصورت نمونہ ہے:

عالم بدل گیا نگہہ مختصر کے بعد
دنیا ہی دوسری ہے تری اک نظر کے بعد
حسن نظر سے پہلے کوئی شے حسیں نہ تھی
دنیا حسین ہوگئی حسن نظر کے بعد
یوں ترے گیسو کبھی برہم نہ تھے
راہ جاں میں اتنے پیچ و خم نہ تھے
آپ کے لطف و کرم کچھ کم نہ تھے
زخم دل ہی لائق مرہم نہ تھے

یہ اشعار لفظی پیچیدگی اور بھاری پن سے مبرّیٰ ہونے کے سبب بڑی آسانی سے قاری کو اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں۔ حفیظ ایک صاف گو اور حق پسند شاعر تھے۔ جو ان کے جذبۂ خلوص پر دال ہے:

حق پرستی کا یہی اجر ملا کرتا ہے
اپنے کاندھے پہ صلیب اپنی اٹھا کر چلیے
دل کا دروازہ کھلا رکھیے ہر انساں کے لیے
دشمنوں کو بھی کلیجے سے لگا کر چلیے
صرف قدموں کو ملانے سے نہ طے ہوگا سفر
فاصلہ ہے جو دلوں میں وہ مٹا کر چلیے

حفیظ بنارسی کی شناخت بطور شاعر مسلم ہے لیکن ان کی نثر نگاری پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی ہے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ وہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے اور ان کی نثر نہایت چست اور سبک ہے۔ یہاں ان کی نثر کے چند نمونے پیش کیے جارہے ہیں، جن سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کتنی اچھی نثر لکھنے پر قادر تھے:

"غزالاں" کے مقدمے میں غزل کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں: "اچھی غزل کے لیے موسیقی الفاظ کے ساتھ نغمگی خیال کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ بات تو ہر اچھی شاعری کے لیے کہی جاسکتی ہے مگر غزل کے لیے یہ روح رواں کا درجہ رکھتی ہے۔ الفاظ اور خیال دونوں کے حسین امتزاج سے غزل "غزل" بنتی ہے۔ اگر ہم نے یہ نکتہ فراموش کردیا یا اس کی طرف سے بے رخی یا عدم توجہی برتی تو ہماری غزل کھردری غزل، آزاد غزل اور بیمار غزل تو رہ جائے گی مگر صحیح معنوں میں غزل کہلانے کی مستحق نہ ہوگی۔"

60 کی دہائی میں ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد "جدیدیت" کا آغاز ہوا۔ اگرچہ جدیدیت کی عمر مختصر ثابت ہوئی اور بعض ناقدین کے بقول آج مابعد جدیدیت کا عہد ہے لیکن حفیظ بنارسی نے جدیدیت کے رنگ و آہنگ کو بھی قبول کیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

"میں نے اردو غزل کے جدید رنگ و آہنگ کو بھی قبول کیا ہے مگر صالح روایات کا احترام کرتے ہوئے۔ جدیدیت میرے لیے کوئی شجر ممنوعہ (Forbidden Fruit) نہیں ہے مگر میرا عقیدہ ہے کہ جدت روایت کے ہی بطن سے پیدا ہوتی ہے اور روایت سے مکمل انحراف نہ تو ممکن ہے اور نہ سودمند۔"

اردو شاعری پر ایک الزام کی تکرار ہوتی رہی ہے کہ اس میں غیر ملکی فضا کا عکس جھلکتا ہے اور ہندوستانیت کی بو باس کم ہے لیکن اس قسم کا الزام وہی لوگ لگاتے ہیں جو اردو ادب کے شعری سرمائے سے ناواقف ہیں یا لسانی تعصب کا شکار ہیں۔ حفیظ بنارسی نے اس الزام کو یکسر مسترد کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اردو شاعری کی مختلف اصناف سخن کی روح ہندوستانی ہے۔ مثنوی، مرثیہ اور اردو گیت تو خاص طور پر ہندوستانی رنگ و آہنگ اور مقامی رسم و رواج کے آئینہ دار ہیں۔ اردو کے ایسے شعرا کی فہرست طویل ہے، جن کے کلام میں ہندوستانیت آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ بہادری کی بات آتی ہے تو اردو شعرا رستم و سہراب کے ساتھ بھیم اور ارجن کا نام بھی فخر کے ساتھ لیتے ہیں۔ تقدس اور عصمت کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مریم کے ساتھ سیتا جی کو بھی یاد کرتے ہیں۔ عدم تشدد اور امن و امان کے ضمن میں گوتم بدھ اور مہاتما گاندھی کا نام بھی احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔ وحدانیت کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں گرونانک جی کی بھی مدح سرائی کی جاتی ہے۔ کوثر و زمزم کی پاکیزگی کے ساتھ گنگ و جمن کی پوترتا کے گن بھی گاتے ہیں۔ پھولوں کی بات آتی ہے تو لالہ و گل و نرگس و نسترن کے ساتھ ہی جوہی بیلا، چمبیلی اور رات کی رانی کی رنگینی و رعنائی سے بھی اپنے دامن شوق کو سجاتے ہیں اور اپنے مشام جاں کو معطر کرتے ہیں۔ طور و سینا کے ساتھ ہمالہ اور کیلاش پربت کا درشن بھی دکھلاتے ہیں۔ غرض یہ کہ اردو شاعری کا دامن ہندوستانیت سے بھرا پڑا ہے اور اس پر بدیسی ہونے کا الزام بالکل غلط اور سراسر بہتان ہے۔"

حفیظ بنارسی نے گلستان شاعری کی اپنے مصورانہ رنگ سے جس انداز میں تزئین کی، وہ لائق ستائش ہے۔ بحیثیت نثر نگار ان کی شناخت کے لیے اس مضمون میں پیش کردہ اقتباسات ہی کافی ہیں۔

حفیظ بنارسی آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کا شعری کلیات "سفیر شہر دل" ایک قیمتی وراثت کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے، جو اہل ذوق کو ان کے فکر وفن سے استفادے کا موقع فراہم کرتا رہے گا۔

□□□

پتہ:
Tazeen Apartment, 179/22,
Zakir Nagar, New Delhi-2

سرور الہدیٰ

امداد امام اثر اور مطالعۂ میر

امداد امام اثر نے ''کاشف الحقائق'' کی دوسری جلد میں میر کی شاعری پر اپنی رائے دی ہے۔ ''آب حیات'' اور ''مقدمۂ شعر و شاعری'' کے بعد کاشف الحقائق ایسی تیسری کتاب ہے جس میں میر کو باضابطہ موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ حالی نے مقدمہ میں میر سے متعلق اختصار سے کام لیا ہے لیکن محمد حسین آزاد نے بہت تفصیل سے میر کا ذکر کیا ہے، کاشف الحقائق میں آب حیات کی طرح میر کے بارے میں تفصیلی گفتگو نہیں ہے لیکن کاشف الحقائق کو مطالعۂ میر کی تاریخ میں کچھ امتیازات حاصل ہیں۔ حالی نے میر کے دھیمے لہجے اور اس کی تہہ میں جوش کی موجودگی پر زور دیا تھا گو کہ محمد حسین آزاد ''آب حیات'' میں میر کے تعلق سے ان خوبیوں کی جانب اشارہ کر چکے تھے۔ بعد کو مولوی عبد الحق نے ''انتخاب میر'' کے دیباچے میں اس تہہ نشیں جوش پر زور دیا تھا۔ اثر نے میر کی غزل اور مثنوی دونوں پر الگ الگ گفتگو کی ہے۔ میر کے حوالے سے اثر کا یہ بھی امتیاز ہے کہ انھوں نے میر کا موازنہ میر کے ہم عصر اور بعد کے شعرا سے کیا ہے۔ ممکن ہے کہ کاشف الحقائق میں موازنے اور تقابل کی یہ صورت آج پرانی معلوم ہو لیکن اس کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ امداد امام اثر نے اپنی بات ان الفاظ سے شروع کی ہے:

''میر نام نامی آپ کا میر محمد تقی ہے۔ لاریب میر صاحب اردو کے سلطان المتغزلین ہیں۔ اور استاد ناسخ کی عقیدت مندی ان کی جناب میں بے سبب نہ تھی۔ آپ بے بہرہ ہیں جو معتقد میر نہیں''

(کاشف الحقائق، ص۔416)

مندرجہ بالا جملوں کا تعلق اس حصے سے ہے جو میر کی غزل گوئی سے متعلق ہے، میر کو اردو کا سلطان المتغزلین کہنا غزل ہی کے سیاق میں ہے۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ تغزل غزل سے مخصوص نہیں یہ خوبی کسی بھی شعری صنف سے پیدا ہو سکتی ہے۔ وحید اختر نے اپنی کتاب ''خواجہ میر درد تصوف اور شاعری'' میں تغزل کو زندگی کے مختلف معاملات کی روشنی میں دیکھا ہے جو تغزل کے تعلق سے فکری سطح پر ایک اضافہ ہے۔ امداد امام اثر نے جن معنوں میں میر کو سلطان المتغزلین قرار دیا ہے وہ ان کے تنقیدی مقدمات سے واضح ہے۔ اثر نے میر کے لیے دل کرفتگی، محزونی، نشتریت، سوز و گداز، خستگی، رنگینی، ملاحت، شیرینی، شوخی، کیفیات قلبی جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اگر ان الفاظ پر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ اثر کے نزدیک میر کی شاعری مختلف رنگ و آہنگ کا مجموعہ ہے۔ یہ اثر ہی ہیں جنھوں نے خستگی، محزونی کی کیفیات کے ساتھ ساتھ میر کے لیے رنگینی اور شوخی کو بھی دریافت کر لیا تھا۔ میر تنقید ایک طویل عرصے تک میر کو غم و اندوہ کا شاعر ثابت کرتی رہی۔ اثر میر کو سلطان المتغزلین قرار دینے کے بعد ناسخ کو درمیان میں لا کر اپنی رائے کو اپنے موقف کی تائید بھی چاہتے ہیں۔ عہد جدید کے کئی اہم نقادوں نے میر کی عظمت کے اعتراف کے بعد ناسخ کے مصرعہ'' آپ بے بہرہ ہیں جو معتقد میر نہیں'' کو پیش کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میر کے بارے میں نقادوں کو ایک مشکل در پیش رہی ہے۔ یہ مشکل ہر اس شخص کو پیش آتی ہے جو میر کو سنجیدگی سے پڑھنا اور سمجھنا چاہتا ہے۔ لیکن اس مسئلے پر غور نہیں کیا گیا کہ آخر ناسخ جیسا شاعر جو میر سے مختلف قسم کا شعری مزاج رکھتا ہے وہ کیوں کر میر سے اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتا ہے۔ ناسخ کے خیال کو غالب نے مزید زندگی بخش دی:

''غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ''

کیا ناسخ کی شاعری پر میر کا کوئی اثر ہے؟ یا ناسخ کی میر سے یہ عقیدت مندی ایک تہذیبی پس منظر رکھتی ہے۔ اور اسی لیے ناسخ میر کی استادی کا اعتراف کرتے ہیں۔ امداد امام اثر یہ بھی لکھتے ہیں کہ میر سے ناسخ کی عقیدت مندی بے سبب نہ تھی۔ اثر بھی اس مسئلے سے سرسری گزر گئے۔ جب وہ ناسخ کی عقیدت کو بلا سبب نہیں بتاتے تو ایسے انھیں عقیدت مندی کے اسباب پر بھی غور کرنا چاہیے تھا۔ امداد امام اثر نے میر سے ناسخ کی عقیدت مندی کا ذکر سلطان المتغزلین کی ترکیب کے ساتھ کیا ہے۔ لہٰذا کچھ عجب نہیں کہ ناسخ کی میر پسندی کا سبب میر کا تغزل ہو۔ انھوں نے میر کے چھ دیوان کا ذکر کرتے ہوئے بہت سے اشعار کو ترک کر دینے کا مشورہ دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''میر صاحب کے چھ دیوان ہیں اس میں شک نہیں کہ ان میں بہت اشعار ایسے ہیں کہ ترک کر دینے کے قابل ہیں۔ اس لیے ان میں یا پست خیالی کا نقصان لاحق ہے یا ان کی شان اس قدر کم ہے کہ ان کو میر صاحب کے کلام ہونے کا رتبہ حاصل نہیں ہے۔''

پست خیالی سے اثر کی مراد کیا ہے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر وہ عہد غالب کے دیگر مفکروں اور ادیبوں کی طرح ادب کے سماجی و افادی پہلو پر زور دیتے ہوئے میر کی پست خیالی کا ذکر کرتے تو بات واضح ہو جاتی۔ مگر میر کے حوالے سے ان کا کوئی سماجی و افادی اجنڈا نہیں ہے۔ یہ کسی طرح بھی محسوس نہیں ہوتا کہ وہ غیر ضروری طور پر میر سے کسی خاص طرح کے معنی و مفہوم کا تقاضا کرتے ہیں۔ حالی اور ان کے رفقا نے اب تک کی شاعری کو

ترک کردینے کا مشورہ دیا تھا جو اخلاق میں گراوٹ کا سبب بنتا ہو یا وہ شاید پہلے نقاد ہیں جنھوں نے میر کے شعری انتخاب پر زور دیا تھا:

"اس پر بھی اگر ان چھ دیوانوں سے انتخاب اشعار کیا جائے تو ایک نہایت حسب مراد دیوان مرتب ہوسکتا ہے۔" [کاشف الحقائق، ص۔416]

اگر میر کے انتخاب پر غور کیجیے تو امداد امام اثر کے انتخابی نظر کی تاریخی اہمیت سمجھ میں آسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ میر کے تمام شعری انتخابات ایک جیسے نہیں ہیں لیکن اثر جسے "حسب مراد" کہتے ہیں وہ ہر انتخاب کرنے والے کے ذوق اور مطالعے سے مشروط ہے:

"اگر میر صاحب کے منتخب کلام پر نگاہ ڈالیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام سے زیادہ خوبصورت کلام زبان اردو میں کہیں نہیں ہے اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ خواجہ میر درد کو مستثنیٰ کر کے کسی شاعر ریختہ گو کو آج تک ان کے کلام کی ہوا بھی نہیں لگی۔ واقعی میر صاحب کچھ ایسا کہہ جاتے ہیں کہ ویسا کہنا تو درکنار ان کے دومصرعے کا چربہ بھی کسی سے نہیں اتر سکتا، سارا دیوان ذوق یا ناسخ کا پڑھ ڈالیے ایک مصرع بھی کہیں نظر نہ آئے گا جس پر میر صاحب کے کلام کا دھوکہ ہو سکے۔" [کاشف الحقائق، ص۔416]

امداد امام اثر نے میر کے منتخب کلام کو نہایت خوبصورت بتایا ہے اور یہ خوبصورتی اردو کے کسی شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ لفظ خوبصورت کا تصور اثر کے یہاں کیا ہے اس کے بارے میں اثر کے بیانات سے کچھ سمجھا جا سکتا ہے۔ میر کی شعری خوبصورتی کا اعتراف تو ہر زمانے میں کیا گیا اور ہر مکتبۂ فکر کے نقادوں نے اپنے اپنے طور پر اس خوبصورتی کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ امداد امام اثر اگر کچھ اشعار کی مدد سے اپنے ان مقدمات کو نشان زد کرتے تو ان کے تنقیدی موقف کی اہمیت دو چند ہو جاتی لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اثر نے میر کی شاعری کو اردو کا سب سے خوبصورت کلام قرار دے کر، ہمیں کچھ سوچنے پر آمادہ کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ اس لفظ "خوبصورت" میں وہ کون سے شعری محاسن ہیں جو میر کی شاعری کے علاوہ کہیں اور پیدا نہیں ہو سکے۔ اس سلسلے میں اثر کے وہ بیانات بہت اہم ہیں جن کا تعلق میر کی داخلی دنیا سے ہے۔ ان کا یہ جملہ بھی بے حد اہم ہے: "واقعی میر صاحب کچھ ایسا کہہ جاتے ہیں کہ ویسا کہنا تو درکنار ان کے دومصرعے کا چربہ بھی کسی سے نہیں اتر سکتا۔" "کچھ ایسا کہہ جانا" کا فقرہ میر کے اسلوب اور میر کی حسیت دونوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ میر کی تمام تر فنی دسترس میر کی وجودی فکر اور اندر کی آگ سے زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ فن کا یہ تصور میر کو لفظ پرست نہیں بلکہ لفظ شناس بناتا ہے۔ میر "کچھ ایسا کہہ جانا" زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو فنی دسترس کے اظہار کی نذر کرنے کے بجائے انھیں زندگی کی گہری بصیرت عطا کرتا ہے۔ میر کے یہاں یہ بصیرت زندگی کی اس سطح پر جینے سے آتی ہے:

جب رات سر پٹکنے نے تاثیر کچھ نہ کی
لاچار میر منڈکری سی مار سو گیا

امداد امام اثر کے "کچھ ایسا کہہ جانا" میں وہ اسرار اور ظرفیت بھی شامل ہیں جن کے بارے میں خود میر نے کہا تھا:

عجب ہوتے ہیں شاعر بھی میں اس فرقے کا عاشق ہوں
کہ بے دھڑکے بھری محفل میں یہ اسرار کہتے ہیں

امداد امام اثر میر کی شعری خوبیوں کو خواجہ میر درد کے یہاں دیکھنے میں کامیاب ہوئے۔ بقیہ کے بارے میں وہ یہ لکھتے ہیں کہ ان کے کلام کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اثر کا یہ بیان 1900 کے آس پاس کا ہے۔ اس وقت تک ریختہ کے جن شعرا کو ہم جانتے ہیں ان کے بارے میں یہاں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بیان میر کی انفرادیت کی جانب اشارہ تو کرتا ہے لیکن اس میں جذباتیت بھی شامل ہوگئی ہے۔ اگر وہ جذباتیت کی رو میں نہ بہتے تو انھیں میر کا پرتو کچھ میر کے دیگر ہم عصر شعرا کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔ لہٰذا ہوا تک نہیں لگی، کہنا درست نہیں ہوسکتا۔ ان کے ایک اہم معاصر سودا کا شعری مزاج میر سے مختلف ہے لیکن ان کی غزلوں میں ایسے مقامات بھی آتے ہیں جہاں میر کا گمان ہوتا ہے، مثلاً:

گرم جوشی نہ کرو مجھ سے کہ مانند چنار
اپنی ہی آگ میں میں آپ جلا جاتا ہوں

امداد امام نے میر کی انفرادیت کو واضح کرنے کے لیے دیوان ذوق اور ناسخ کو پڑھنے کی بات کہی ہے۔ ہر سنجیدہ طالب عالم ذوق اور ناسخ کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا ہے، لہٰذا وہ اثر کے اس انتخاب کی داد ضرور دے گا کہ انھیں دیوان ذوق اور ناسخ، میر کے دیوان سے بہت مختلف نظر آیا۔ شاید امداد امام اثر کی اردو تنقید کی تاریخ میں پہلی مرتبہ میر کو اس سطح پر دریافت کرنے کی کوشش تھی۔ ان کے تنقیدی ذہن نے میر کی انفرادیت کو جن بنیادوں پر تلاش کیا تھا وہ امداد امام اثر کے عہد میں کہیں اور دکھائی نہیں دیتیں۔ اثر میر کے بارے میں دھیمے لہجے اور تہہ نشیں جوش سے آگے جاتے ہیں۔ وہ واردات قلبیہ کے ساتھ امور ذہنیہ کو بھی شامل کرتے ہیں:

"اس حیرت افزا غزل سرائی کا سبب جو ڈھونڈتے تو صرف اتنی باتوں میں محدود پاتا جاتا ہے کہ میر صاحب غزل سرائی میں کبھی واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے احاطہ سے باہر قدم نہیں رکھتے ہیں اور ان کے وہی اشعار زیادہ دل آویز معلوم ہوتے ہیں جو زیادہ واردات قلبیہ سے متعلق معلوم ہوتے ہیں۔ میر صاحب کی غزل سرائی تمام تر شاعری کا داخلی پہلو رکھتی ہے۔"
[کاشف الحقائق، ص۔417]

یہ بات بھی کم حیرت افزا نہیں کہ اثر میر کی غزل گوئی کو حیرت افزا غزل سرائی کا نام دیتے ہیں۔ حیرت افزا غزل سرائی کی ترکیب میر کی شاعری کے سیاق میں کس قدر با معنی نظر آتی ہے۔ اثر کی نظر میں اس حیرت افزا غزل سرائی کا سبب واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے میر کی وابستگی ہے۔ یہاں واردات قلبیہ کے ساتھ امور ذہنیہ کی نشاندہی امداد امام اثر کی دریافت ہے اور یہی وہ ترکیب ہے جو اثر کو مطالعۂ میر میں تاریخی حیثیت عطا کرتی ہے۔ عموماً میر کی شاعری کو اس عہد میں واردات قلبیہ کے ساتھ مشروط کر کے دیکھا گیا لیکن اثر نے اس کے ساتھ امور ذہنیہ کی ترکیب کو شامل کر کے میر کے احساس کی شدت اور داخلی کرب کو ایک مخصوص انداز نظر اور انداز فکر سے بھی وابستہ کر دیا ہے۔ امور ذہنیہ سے اثر کی مراد ذہانت اور فطانت ہی نہیں بلکہ حیات و کائنات کے بارے میں غور و فکر کا ایک مخصوص انداز بھی ہے۔ اثر کی یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ میر واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ میر کے شعری کردار اور اس کی اخلاقی اقدار کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میر نے اپنی ذہانت اور آگہی کو زندگی کی بعض قدروں سے ماورا جانے نہیں دیا۔ زندگی اور کائنات کے بارے میں ان کے یہاں اسی لیے کسی بغاوت اور کشمکش کی وہ صورت نظر نہیں آتی جو غالب کے یہاں دکھائی دیتی ہے۔ یہاں اس بحث کو نہ لائیے جن کا تعلق قشقہ کھینچنے اور اس قسم کے دوسرے بیانات سے ہے۔ اثر نے امور واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے باہر قدم نہ رکھنے کی بات کہہ کر میر کی پوری شاعری کو سمجھنے کا ایک زاویہ فراہم کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میر کی شاعری میں وہ مضامین بھی ملتے ہیں جنھیں آسانی سے غیر اخلاقی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اثر نے جس سیاق میں باہر قدم نہ رکھنے کی بات کی ہے اس کا تعلق میر کے اپنے فطری اسلوب کے ساتھ اس فکرمندی سے بھی ہے جس کے بارے میں میر نے کہا تھا:

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

اگر میر واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے باہر قدم رکھتے تو توہم کے کارخانے میں اعتبار کی یہ صورت نکالنے میں کامیاب نہ ہوتے۔ لیکن غالب ان حدوں سے آگے جا کر یہ کہتے ہیں:

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

یہ واضح رہے کہ اثر نے جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے ان کا تعلق میر کے انتخاب کلام سے ہے۔ خواجہ میر درد اور میر کی شاعری میں جو مشترک کیفیات ہیں اثر نے انھیں سوز و گداز، خستگی اور نشتریت کا نام دیا ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ درد کے کلام میں خستگی کم ہے اور میر کے یہاں سوز و درد زیادہ ہے، لیکن وہ پاکیزگی اور نفاست کے معاملے میں درد کو میر پر فوقیت دیتے ہیں۔ امداد امام اثر نے خستگی کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ وہ جیسے شاعری کی سب سے بڑی خوبی ہو۔ وہ یہ بھی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ میر اور درد ہی ایک دوسرے کے جواب ہو سکتے ہیں۔ امداد امام اثر تقابل اور موازنے کے عمل میں ایک اہم بات کی طرف متوجہ کرتے ہیں:

’’مگر میر صاحب کو خواجہ صاحب پر غلبہ نظر آتا ہے وہ قوت شاعری کے اعتبار پر ہے کہ یہ قوت میر صاحب کو خواجہ صاحب سے زیادہ حاصل تھی۔‘‘
[کاشف الحقائق، ص۔ 417]

’’قوت شاعری‘‘ کی ترکیب بہت پرانی ہو چکی ہے لیکن ہم اسے ہر کس و ناکس کے لیے استعمال نہیں کر سکتے۔ قوت شاعری کا تعلق فنی دسترس سے بھی ہے اور قوت متخیلہ سے بھی۔ خواجہ میر درد کے یہاں بھی یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں لیکن امداد امام کو محسوس ہوتا ہے کہ میر کو درد کے مقابلے میں قوت شاعری زیادہ حاصل تھی۔ ’’قوت شاعری‘‘ کی تشریح و تعبیر کے تعلق سے بہت کچھ کہنے اور لکھنے کی گنجائش ہے، کوئی اسے میر کی قادر الکلامی کا نام دے سکتا ہے جس کا ایک اہم حوالہ لفظی و معنوی رعایتوں اور مناسبتوں کا التزام ہے۔ قوت شاعری کو خیال بندی کی روشنی میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ امداد امام اثر شاعری میں لفظی، معنوی رعایتوں پر اور خیال بندی کو مقصد بالذات نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر یہ باتیں فطری طور پر پیدا ہو جائیں تو ٹھیک ہے، ’’واقعی کیا کیا دشوار مضامین کو جو محض قلب و ذہن سے متعلق ہیں میر صاحب ایسی آسانی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بیان فرما جاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ان کی سادگی زبان کا عالم فی الحقیقت نرالا ہے۔ بیان مضامین بیشتر تشبیہ، استعارہ اور مبالغہ سے احتراز رکھتا ہے اور اگر کہیں ان صنعتوں کو دخل بھی دیتے ہیں تو اس خوبصورتی سے کہ آورد کی کیفیت مطلق ظاہر نہیں ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب شاعر سخن سنجی میں کامل نظر آتا ہے تب ہی تشبیہ، استعارہ اور مبالغہ سے اپنے کلام میں اعانت کرتا ہے۔‘‘ [کاشف الحقائق، ص۔ 423]

حالی اور ان کے رفقا کی اس بات پر گرفت کی جاتی ہے کہ انھوں نے شعری لوازمات سے صرف نظر کرتے ہوئے شاعری کو سپاٹ اور بے رس بنانے کی وکالت کی۔ خصوصاً وہ لوگ زیادہ معترض ہوتے ہیں جن کے نزدیک شاعری کو پہلے فنی نقطۂ نظر سے شاعری ہونا ضروری ہے۔ شاعری میں کیسے مضامین ہیں اور ان کا سیاسی اور سماجی پس منظر کیا ہے یہ سب باتیں ثانوی اور غیر ضروری ہیں۔ امداد امام اثر بھی شاعری میں تشبیہ و استعارہ کو مفقود نہیں جانتے وہ ان کے فطری استعمال پر زور دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حالی اور دوسرے دانشوروں اور ادیبوں کے پاس ایک سماجی ایجنڈا تھا، اسی لیے ادب کی افادیت کا نعرہ بلند کرتے وقت یہ بھول گئے کہ کلاسیکی شاعروں کے نزدیک

شاعری کی تعریف کیا تھی۔ امداد امام اثرؔ تشبیہ، استعارہ اور مبالغہ سے شاعری کی دلچسپی کو فکری مفلسی و قلادستی کا سبب بناتے ہیں۔ ظاہر ہے اس سے سخت بات کچھ اور نہیں ہوسکتی۔ ادب کے ادبی معیار پر زور دینے والوں کو امداد امام اثر کا یہ بیان مضحکہ خیز معلوم ہوگا۔ اس مضحکہ خیزی کی تہہ میں انھیں نوآبادیاتی ذہن کا جبر بھی نظر آسکتا ہے۔ لیکن یہاں امداد امام اثر ادب کے افادی اور تعمیری پہلو کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ عام طور پر اس تعمیری اور افادی پہلو کو نوآبادیاتی ذہن ہی سے مشروط کر کے دیکھا جاتا رہا ہے۔ امداد امام اثر نے بعض بیانات سے فکر اور زبان کی دوئی بھی سامنے آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مگر ان کے مضامین کی عمدگی ایسی ہے کہ بے اختیار دل پر عجب باسراد تاثیر پیدا کرتی ہے۔'' [کاشف الحقائق، ص۔423]

مضامین کی عمدگی کا اظہار جب وسیلے سے ہوتا ہے وہ فکر سے الگ کوئی شئے نہیں ہے۔ یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ مگر اثر اس کی دوئی کو شاید محسوس نہیں کر سکے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہوسکتی ہے کہ انھیں مبالغہ اور امتیاز کو شاعری کا مقصود نہیں بلکہ ایک وسیلہ بتانا تھا۔ میر کے باب میں امداد امام اثر میر کو جن کیفیات کے سبب میر درد سے فائق بتاتے ہیں خواجہ میر درد کے باب میں انھی کیفیات کے حوالے سے درد کو میر سے فائق ٹھہرا کر اپنے ہی بیان میں تضاد پیدا کر دیا ہے۔

وہ شعر و ادب کے باب میں لکھتے ہیں:

''اگر انھیں داخلی شاعری پر کچھ اور بھی قدرت ہوتی تو غزل گوئی میں میر کے ہم سر مانے جاتے۔ یوں تو اور اصناف شاعری میں وہ میر سے بہت بڑھے ہوئے تھے، میر صاحب کو خارجی شاعری کی بہت کم قوت حاصل تھی بلکہ سودا کے مقابلے میں کچھ نہ تھی۔''

امداد امام اثر میر کی غزل گوئی کو دیگر شعرا سے مختلف بتانے کے لیے داخلی شاعری اور خارجی شاعری جیسے دو خانے بناتے ہیں اور ہر جگہ میر کے ذکر میں ''داخلی شاعری'' کا فقرہ ضرور استعمال کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میر کا مخصوص کلام انھیں میر کی شاعری کے دوسرے رنگ کی طرف جانے سے روکتا ہے۔ اس کی ذمے داری میر کے شعری متن پر نہیں بلکہ اثر کے تنقیدی موقف پر عائد ہوتی ہے۔ اس سے امداد امام اثر کا مخصوص شعری ذوق بھی سامنے آجاتا ہے۔ ایک مقام پر وہ میر کے بارے میں لکھ چکے ہیں کہ وہ واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ کچھ یہی قدرت ہمیں اثر کے یہاں مطالعۂ میر میں نظر آتی ہے۔ اگر وہ اپنی خود ساختہ تنقیدی حدود سے باہر نکلتے تو انھیں یہ شکایت نہ ہوتی کہ میر کو خارجی شاعری کی قوت حاصل نہیں تھی اور سودا کی شاعری داخلی عناصر سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی ہے۔ امداد امام اثر خارجی اور داخلی شاعری کی تقسیم اپنے طور پر ٹھیک ہی کرتے ہیں لیکن وہ اس تقسیم کے تئیں اتنے حساس ہیں کہ شعری متن کو ان دو خانوں میں تقسیم نہیں کرتے۔ گویا ایک شاعر یا تو خارجی شاعری کی نمائندگی کرے گا یا پھر داخلی شاعری کی۔ وہ ان کے درمیان کی ہم آہنگی کو بھی تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ داخلی اور خارجی عناصر کا ان کے تنقیدی ذہن پر اتنا اثر ہے کہ وہ تکرار کے ساتھ مختلف شعرا کے باب میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ میر کا اور غالب کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بہر حال غالب کا یہ فرمانا کہ ہم میر کے رنگ میں در آئے واقعات سے بہت بعید نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کی غزل سرائی میں میر کی جھلک نمایاں ہے۔ لاریب واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے مضامین غالب قریب قریب میر صاحب کے پر تاثیری کے ساتھ باندھ جاتے ہیں مگر حالت یہ ہے کہ ان کے مختصر دیوان میں بہت کم شعر ہیں جو میر صاحب کی سادگی کلام کا لطف دکھاتے ہیں۔ زیادہ حصہ ان کے کلام کا استعارات سے بھرا ہوا ہے۔ اضافتوں کی وہ بھرمار ہے کہ بعض وقت جی گھبرا اٹھتا ہے۔''

[کاشف الحقائق، ص۔435]

امداد امام اثر واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے مضامین کو کوئی نام یا عنوان دینے سے احتراز کرتے ہیں۔ مندرجۂ بالا اقتباس میں میر اور غالب کی مشترک شعری خصوصیات کی نشاندہی میں صرف پُر تاثیری اظہار کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ پُر تاثیری اظہار کا رشتہ داخلی عناصر سے ہے۔ امداد امام اثر کے تنقیدی سروکار سے یہ بات شاید اس وقت زیادہ متعلق نہیں تھی کہ آخر یہ تاثیر کیوں کر پیدا ہوتی ہے، کیا میر اور غالب کے پُر تاثیری اظہار میں کوئی فرق بھی ہے؟ خارجی عناصر اور داخلی عناصر ایک دوسرے میں مدغم بھی ہو سکتے ہیں۔ خارجی عناصر کو ہی شاعر داخلی دنیا کا حصہ بنالیتا ہے۔ آج جسے ہم وجودی فکر کہتے ہیں وہ تخلیق کار کے داخل سے پیدا ہوتی تو ہے لیکن اس کا تعلق خارج سے بھی ہے۔ میر اور غالب کے تخلیقی سروکار کا بنیادی فرق دراصل دونوں کے شعری مزاج کا فرق بھی ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ شاعری میں تاثیر کا اصل سبب اسلوب کی سادگی ہے۔

انھیں شکایت ہے کہ غالب کی شاعری میں استعارات اور اضافتوں کی بھرمار ہے۔ اس کثرت کو دیکھ کر ان کا جی گھبرا اٹھتا ہے۔ استعارات اور اضافتوں سے امداد امام اثر کی یہ وحشت دراصل ایک مخصوص شعری مزاج اور ذوق کا پتہ دیتی ہے۔ امداد امام اثر کی تحریروں پر نوآبادیاتی جبر کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ ادب کے افادی نقطۂ نظر کو نہ تو رائج کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی وہ اپنے ماضی کے سرمائے سے اپنی کوئی بازپرس کرتے ہیں جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ حالی اور دیگر دانشوروں کے سماجی ایجنڈا کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ ناصر عباس نیر نے اپنے ایک مضمون اثر کی تنقید میں اسی بات کو شاید پہلی مرتبہ

یہ بات بھی کم حیرت افزا نہیں کہ اثر میر کی غزل گوئی کو حیرت افزا غزل سرائی کا نام دیتے ہیں۔ حیرت افزا غزل سرائی کی ترکیب میر کی شاعری کے سیاق میں کس قدر بامعنی نظر آتی ہے۔ اثر کی نظر میں اس حیرت افزا غزل سرائی کا سبب واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے میر کی وابستگی ہے۔ یہاں واردات قلبیہ کے ساتھ امور ذہنیہ کی نشاندہی امداد امام اثر کی دریافت ہے اور یہی وہ ترکیب ہے جو اثر کو مطالعۂ میر میں تاریخی حیثیت عطا کرتی ہے۔ عموماً میر کی شاعری کو اس عہد میں واردات قلبیہ کے ساتھ مشروط کر کے دیکھا گیا لیکن اثر نے اس کے ساتھ امور ذہنیہ کی ترکیب کو شامل کر کے میر کے احساس کی شدت اور داخلی کرب کو ایک مخصوص انداز نظر اور انداز فکر سے بھی وابستہ کر دیا ہے۔امور ذہنیہ سے اثر کی مراد ذہانت اور فطانت ہی نہیں بلکہ حیات و کائنات کے بارے میں غور و فکر کا ایک مخصوص انداز بھی ہے۔ اثر کی یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ میر واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ میر کے شعری کردار اور اس کی اخلاقی اقدار کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میر نے اپنی ذہانت اور آگہی کو زندگی کی بعض قدروں سے ماورا جانے نہیں دیا۔ زندگی اور کائنات کے بارے میں ان کے یہاں اسی لیے کسی بغاوت اور کشمکش کی وہ صورت نظر نہیں آتی جو غالب کے یہاں دکھائی دیتی ہے۔ یہاں اس بحث کو نہ لائیے جن کا تعلق تشنہ کھینچنے اور اس قسم کے دوسرے بیانات سے ہے۔ اثر نے امور واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے باہر قدم نہ رکھنے کی بات کہہ کر میر کی پوری شاعری کو سمجھنے کا ایک زاویہ فراہم کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میر کی شاعری میں وہ مضامین بھی ملتے ہیں جنھیں آسانی سے غیر اخلاقی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اثر نے جس سیاق میں باہر قدم نہ رکھنے کی بات کی ہے اس کا تعلق میر کے اپنے فطری اسلوب کے ساتھ اس فکر مندی سے بھی ہے جس کے بارے میں میر نے کہا تھا:

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

اگر میر واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے باہر قدم رکھتے تو توہم کے کارخانے میں اعتبار کی یہ صورت نکالنے میں کامیاب نہ ہوتے۔ لیکن غالب ان حدوں سے آگے جا کر یہ کہتے ہیں:

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

یہ واضح رہے کہ اثر نے جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے ان کا تعلق میر کے انتخاب کلام سے ہے۔ خواجہ میر درد اور میر کی شاعری میں جو مشترک کیفیات ہیں اثر نے انھیں سوز و گداز، خستگی اور نشتریت کا نام دیا ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ درد کے کلام میں خستگی کم ہے اور میر کے یہاں سوز و درد زیادہ ہے، لیکن وہ پاکیزگی اور نفاست کے معاملے میں درد کو میر پر فوقیت دیتے ہیں۔ امداد امام اثر نے خستگی کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ وہ جیسے شاعری کی سب سے بڑی خوبی ہو۔ وہ یہ بھی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ میر اور درد ہی ایک دوسرے کے جواب ہو سکتے ہیں۔ امداد امام اثر تقابل اور موازنے کے عمل میں ایک اہم بات کی طرف متوجہ کرتے ہیں:

''مگر میر صاحب کو خواجہ صاحب پر غلبہ نظر آتا ہے وہ قوت شاعری کے اعتبار پر ہے کہ یہ قوت میر صاحب کو خواجہ صاحب سے زیادہ حاصل تھی۔''
[کاشف الحقائق، ص۔417]

''قوت شاعری'' کی ترکیب بہت پرانی ہو چکی ہے لیکن ہم اسے ہر کس و ناکس کے لیے استعمال نہیں کر سکتے۔ قوت شاعری کا تعلق فنی دسترس سے بھی ہے اور قوت متخیلہ سے بھی۔ خواجہ میر درد کے یہاں بھی یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں لیکن امداد امام کو محسوس ہوتا ہے کہ میر کو درد کے مقابلے میں قوت شاعری زیادہ حاصل تھی۔ ''قوت شاعری'' کی تشریح و تعبیر کے تعلق سے بہت کچھ کہنے اور لکھنے کی گنجائش ہے، کوئی اسے میر کی قادر الکلامی کا نام دے سکتا ہے جس کا ایک اہم حوالہ لفظی و معنوی رعایتوں اور مناسبتوں کا التزام ہے۔ قوت شاعری کو خیال بندی کی روشنی میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ امداد امام اثر شاعری میں لفظی، معنوی رعایتوں پر اور خیال بندی کو مقصد بالذات نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر یہ باتیں فطری طور پر پیدا ہو جائیں تو ٹھیک ہے، واقعی کیا کیا دشوار مضامین کو جو محض قلب و ذہن سے متعلق ہیں میر صاحب ایسی آسانی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بیان فرما جاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ان کی سادگی زبان کا عالم فی الحقیقت نرالا ہے۔ بیان مضامین بیشتر تشبیہ، استعارہ اور مبالغہ سے احتراز رکھتا ہے اور اگر کہیں ان صنعتوں کو دخل بھی دیتے ہیں تو اس خوبصورتی سے کہ آورد کی کیفیت مطلق ظاہر نہیں ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب شاعر سخن سنجی میں کامل نظر آتا ہے تب ہی تشبیہ، استعارہ اور مبالغہ سے اپنے کلام میں اعانت کرتا ہے۔'' [کاشف الحقائق، ص۔423]

حالی اور ان کے رفقا کی اس بات پر گرفت کی جاتی ہے کہ انھوں نے شعری لوازمات سے صرف نظر کرتے ہوئے شاعری کو سپاٹ اور بے رس بنانے کی وکالت کی۔ خصوصاً وہ لوگ زیادہ معترض ہوتے ہیں جن کے نزدیک شاعری کو پہلے فنی نقطۂ نظر سے شاعری ہونا ضروری ہے۔ شاعری میں کیسے مضامین ہیں اور ان کا سیاسی اور سماجی پس منظر کیا ہے یہ سب باتیں ثانوی اور غیر ضروری ہیں۔ امداد امام اثر بھی شاعری میں تشبیہ و استعارہ کو مفقود نہیں جانتے وہ ان کے فطری استعمال پر زور دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حالی اور دوسرے دانشوروں اور ادیبوں کے پاس ایک سماجی ایجنڈا تھا، اسی لیے ادب کی افادیت کا نعرہ بلند کرتے وقت یہ بھول گئے کہ کلاسیکی شاعروں کے نزدیک

شاعری کی تعریف کیا تھی۔ امداد امام اثر تشبیہ، استعارہ اور مبالغہ سے شاعر کی دلچسپی کو فکری مفلسی و قلاشی کا سبب بتاتے ہیں۔ ظاہر ہے اس سے تحت بات کچھ اور نہیں ہوسکتی۔ ادب کے ادبی معیار پر زور دینے والوں کو امداد امام اثر کا یہ بیان مضحکہ خیز معلوم ہوگا۔ اس مضحکہ خیزی کی تہہ میں انھیں نو آبادیاتی ذہن کا چہرہ بھی نظر آسکتا ہے۔ لیکن یہاں امداد امام اثر ادب کے افادی اور تعمیری پہلو کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ عام طور پر اس تعمیری اور افادی پہلو کو نو آبادیاتی ذہن ہی سے مشروط کر کے دیکھا جاتا رہا ہے۔ امداد امام اثر نے بعض بیانات سے فکر اور زبان کی دوئی بھی سامنے آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مگر ان کے مضامین کی عمدگی ایسی ہے کہ بے اختیار دل پر عجب بامراد تاثیر پیدا کرتی ہے۔'' [کاشف الحقائق، ص۔423]

مضامین کی عمدگی کا اظہار جب وسیلے سے ہوتا ہے وہ فکر سے الگ کوئی شئے نہیں ہے۔ یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ مگر اثر اس کی دوئی کو شاید محسوس نہیں کر سکے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہوسکتی ہے کہ انھیں مبالغہ اور امتیاز کو شاعری کا مقصود نہیں بلکہ ایک وسیلہ بتانا تھا۔ میر کے باب میں امداد امام اثر میر کو جن کیفیات کے سبب میر درد سے فائق بتاتے ہیں خواجہ میر درد کے باب میں انھی کیفیات کے حوالے سے درد کو میر سے فائق ٹھہرا کر اپنے ہی بیان میں تضاد پیدا کر دیا ہے۔

وہ شعر و ادب کے باب میں لکھتے ہیں:

''اگر انھیں داخلی شاعری پر کچھ اور بھی قدرت ہوتی تو غزل گوئی میں میر کے ہم سر مانے جاتے۔ یوں تو اور اصناف شاعری میں وہ میر سے بہت بڑھے ہوئے تھے، میر صاحب کو خارجی شاعری کی بہت کم قوت حاصل تھی بلکہ سودا کے مقابلے میں کچھ نہ تھی۔''

امداد امام اثر میر کی غزل گوئی کو دیگر شعرا سے مختلف بتانے کے لیے داخلی شاعری اور خارجی شاعری جیسے دو خانے بناتے ہیں اور ہر جگہ میر کے ذکر میں ''داخلی شاعری'' کا فقرہ ضرور استعمال کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میر کا مخصوص کلام انھیں میر کی شاعری کے دوسرے رنگ کی طرف جانے سے روکتا ہے۔ اس کی ذمے داری میر کے شعری متن پر نہیں بلکہ اثر کے تنقیدی موقف پر عائد ہوتی ہے۔ اس سے امداد امام اثر کا مخصوص شعری ذوق بھی سامنے آجاتا ہے۔ ایک مقام پر وہ میر کے بارے میں لکھ چکے ہیں کہ وہ واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ کچھ یہی قدرت ہمیں اثر کے یہاں مطالعۂ میر میں نظر آتی ہے۔ اگر وہ اپنی خود ساختہ تنقیدی حدود سے باہر نکلتے تو انھیں یہ شکایت نہ ہوتی کہ میر کو خارجی شاعری کی قوت حاصل نہیں تھی اور سودا کی شاعری داخلی عناصر سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی ہے۔ امداد امام اثر خارجی اور داخلی شاعری کی تقسیم اپنے طور پر ٹھیک ہی کرتے ہیں لیکن وہ اس تقسیم کے تئیں اتنے حساس ہیں کہ شعری متن کو ان دو خانوں میں تقسیم نہیں کرتے۔ گویا ایک شاعر یا تو خارجی شاعری کی نمائندگی کرے گا یا پھر داخلی شاعری کی۔ وہ ان کے درمیان کی ہم آہنگی کو بھی تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ داخلی اور خارجی عناصر کا ان کے تنقیدی ذہن پر اتنا اثر ہے کہ وہ تکرار کے ساتھ مختلف شعرا کے باب میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ میر کا اور غالب کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بہرحال غالب کا یہ فرمانا کہ ہم میر کے رنگ میں در آئے واقعات سے بہت بعید نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کی غزل سرائی میں میر کی جھلک نمایاں ہے۔ لاریب واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے مضامین غالب قریب قریب میر صاحب کے پرتاثیری کے ساتھ باندھ جاتے ہیں مگر حالت یہ ہے کہ ان کے مختصر دیوان میں بہت کم شعر ہیں جو میر صاحب کی سادگی کلام کا لطف دکھاتے ہیں۔ زیادہ حصہ ان کے کلام کا استعارات سے بھرا ہوا ہے۔ اضافتوں کی وہ بھرمار ہے کہ بعض وقت جی گھبرا اٹھتا ہے۔''

[کاشف الحقائق، ص۔435]

امداد امام اثر واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے مضامین کو کوئی نام یا عنوان دینے سے احتراز کرتے ہیں۔ مندرجۂ بالا اقتباس میں میر اور غالب کی مشترک شعری خصوصیات کی نشاندہی میں صرف پرتاثیری اظہار کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ پرتاثیری اظہار کا رشتہ داخلی عناصر سے ہے۔ امداد امام اثر کے تنقیدی سروکار سے یہ بات شاید اس وقت زیادہ متعلق نہیں تھی کہ آخر یہ تاثیر کیوں کر پیدا ہوتی ہے، کیا میر اور غالب کے پرتاثیری اظہار میں کوئی فرق بھی ہے؟ خارجی عناصر اور داخلی عناصر ایک دوسرے میں مدغم بھی ہو سکتے ہیں۔ خارجی عناصر کو ہی شاعر داخلی دنیا کا حصہ بنالیتا ہے۔ آج جسے ہم وجودی فکر کہتے ہیں وہ تخلیق کار کے داخل سے پیدا ہوتی تو ہے لیکن اس کا تعلق خارج سے بھی ہے۔ میر اور غالب کے تخلیقی سروکار کا بنیادی فرق دراصل دونوں کے شعری مزاج کا فرق بھی ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ شاعری میں تاثیر کا اصل سبب اسلوب کی سادگی ہے۔

انھیں شکایت ہے کہ غالب کی شاعری میں استعارات اور اضافتوں کی بھرمار ہے۔ اس کثرت کو دیکھ کر ان کا جی گھبرا اٹھتا ہے۔ استعارات اور اضافتوں سے امداد امام اثر کی یہ وحشت دراصل ایک مخصوص شعری مزاج اور ذوق کا پتہ دیتی ہے۔ امداد امام اثر کی تحریروں پر نو آبادیاتی جبر کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ ادب کے افادی نقطۂ نظر کو نہ تو رائج کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی وہ اپنے ماضی کے سرمائے سے اپنی کوئی باز پرس کرتے ہیں جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ حالی اور دیگر دانشوروں کے سماجی ایجنڈا کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ ناصر عباس نیر نے اپنے ایک مضمون اثر کی تنقید میں اسی بات کو شاید پہلی مرتبہ

اثر کے تعلق سے واضح کیا ہے کہ اثر نے نوآبادیاتی جبر کو توڑنے کی کوشش کی۔ اکا دکا مثالوں سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ امداد امام اثر کلاسیکی شاعری کو اس کے اصل سیاق میں یکسانیت چاہتے تھے جیسا کہ بعض نقادوں نے کہا ہے۔ ناصر عباس نیر کے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

''امداد امام اثر واحد اور اردو تنقید میں پہلے نقاد ہیں جنھوں نے نوآبادیاتی صورت حال کے جبر کو توڑا ہے اور مغرب کی ادبی و تنقیدی فکر سے معاملہ ایک آزاد اور فعال ذہن کے ساتھ کیا ہے۔ مگر ستم ظریفی دیکھیے کہ اردو تنقید کے اکثر بیانیوں میں ان کا نام یا تو غائب ہے یا ضمناً موجود ہے۔''

[اخبار اردو، اسلام آباد، ص۔23، مئی 2008]

اضافتوں اور استعارات سے نہیں بلکہ اس کی بھرمار سے اثر کا جی گھبرا اٹھتا ہے۔ ان کا جی کیوں کر گھبرا اٹھتا ہے اس کا جواب اگر کسی اور سے پوچھا جائے تو اثر کے بارے میں نہ جانے کیا کچھ سننے کو ملے گا۔ بات اثر کی فہم اور فراست تک پہنچے گی۔ لہٰذا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ امداد اثر کے افکار کو ان کی ترجیحات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ میر کی شاعری میں استعارات اور اضافیت نہ ہوں۔ میر کے بہت سے ایسے اشعار نکالے جا سکتے ہیں جن کے بارے میں امداد امام اثر کی وہی رائے ہوگی جو غالب کے بارے میں ہے۔ اب کچھ لوگ کلام میر کی اشاعت میں اضافتوں کے التزام کو غیر ضروری قرار دینے لگے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ کلام اپنی اصل قرأت کے ساتھ اس وقت کی سماعتوں تک پہنچتا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اسے کیسے پڑھا جائے گا۔ لہٰذا آج اضافتوں کے التزام کا تقاضہ بے معنی ہے پھر یہ بھی کہ پتہ نہیں تخلیق کار اس کی قرأت کس طرح کرتا تھا۔ کہاں کس لفظ پہ رکنا ہے، کہاں زور دینا ہے، کہاں سے لہجے کو دھیما رکھنا ہے یہ سب کچھ ہمیں آج اپنے طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ صرف الفاظ ہمارے سامنے ہوں اضافتیں نہیں۔ اضافتوں کے ہٹانے کا ایک روشن پہلو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس سے شعر کی کئی قرأت ہو سکتی ہے۔ معلوم نہیں امداد امام اثر کلام میر کی ایسی اشاعت کو دیکھ کر کیا رائے قائم کرتے۔

امداد امام اثر نے ایک عنوان ''میر تقی میر'' بہ حیثیت مثنوی نگار'' بھی قائم کیا ہے لیکن نہایت اختصار کے ساتھ میر کی مثنوی نگاری پر اظہار خیال کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں میر کے متعلق پہلے ہی سے ایک رائے گھر کر چکی ہے کہ اپنی رائے میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش نہیں پائے۔ یہاں بھی وہ مضامین داخلی اور مضامین خارجی کو پیش نظر رکھتے ہیں:

''میر تقی میر۔ میر لاریب سلطان المتغزلین تھے۔ مگر حضرت کی مثنوی نگاری سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو درجہ غزل سرائی میں حاصل ہے وہ مثنوی نگاری میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو صرف مضامین کی بندش کی بڑی قابلیت حاصل تھی لیکن مثنوی نگاری کی وہی شاعر داد دے سکتا ہے جو مضامین خارجی کی بندش پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ یہ قدرت آپ کو بہت حاصل نہ تھی۔ اس لیے آپ کی مثنویاں تمام تر داخلی پہلو کی شاعری کی خبر دیتی ہے۔ در حقیقت آپ کی مثنوی نگاری بھی مضامین کے اعتبار سے ایک قسم کی غزل سرائی نظر آتی ہے۔'' [کاشف الحقائق، ص۔580]

مثنوی کے فنی اور فکری سروکار اور ان دونوں کی آمیزش کے پیش نظر مندرجۂ بالا اقتباس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اثر کی یہ رائے اہمیت کی حامل ہے کہ میر کی مثنوی میں بھی وہ کیفیت موجود ہے جو ان کی غزل کا خاصہ ہے لیکن وہ اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ جیسے میر کی یہ کمزوری ہو، مثنوی کے موضوعات صرف وہی نہیں ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے اثر نے لکھا ہے:

''آپ کی مثنویوں میں خارجی مضامین گویا ندارد ہیں۔ کہیں آپ صحرا، جنگل و جبال، خزاں، بہار، برق، باراں، سرما، گرما، طیور، وحوش آب و سراب وغیرہ وغیرہ کے خوش آئند مضامین کو بیان نہیں فرماتے ہیں۔''

[کاشف الحقائق، ص۔580]

امداد امام اثر کو محسوس ہوتا ہے کہ میر اپنی قوت شعری کے باوجود ان خارجی مضامین کو باندھنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے۔ ایک نقاد کو صاف صاف ہی لکھنا چاہیے جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے کہ اگر وہ میر کے شعری مزاج (محمد حسن عسکری نے میر اور غالب کے لیے اس ترکیب کا بہت استعمال کیا ہے) کو ملحوظ رکھتے تو شاید ان کی رائے مختلف ہوتی۔ گو کہ انھوں نے میر کی خوبیوں کے تعلق سے روحانی اور قلبی معاملات، عاشقانہ کیفیت جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

عصر حاضر میں نقد میر کے حوالے سے ''شعر شور انگیز'' (شمس الرحمٰن فاروقی)، ''تلاش میر'' (نثار احمد فاروقی)، ''میر کی شعری لسانیات'' (قاضی افضال حسین)، ''اسلوبیات میر'' (گوپی چند نارنگ) جیسی کتابیں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن یہ کتابیں تنقیدی روایت کے شعور کے بغیر اتنی بامعنی نہیں ہو سکتی تھیں۔ مندرجہ بالا کتابوں کو پڑھنے کے بعد حالی، آزاد اور اثر کی میر تنقید پرانی معلوم ہوتی ہے جو حیرت کی بات نہیں لیکن ہمارا اپنا تنقیدی شعور آزاد، حالی اور اثر کی تنقیدی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس گرفت کا علمی و منطقی ہی نہیں بلکہ تہذیبی جواز بھی ہے۔'' امداد امام اثر اور مطالعۂ میر'' کو اسی سیاق میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

محمد خلیل

آلو کا عالمی سال 2008

سال 2008 عالمی آلو سال کی شکل میں منایا جا رہا ہے۔ اس کا فیصلہ اقوام متحدہ کے آفس میں گزشتہ 18 اکتوبر 2007 کو کیا گیا تھا۔ یہ موقع عالمی غذائی اشیا کا دن تھا۔ اس موقع پر اقوام متحدہ کے سینئر افسران اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے پوٹیٹو کمیونٹی کے اراکین میں بھی شامل تھے۔

آج غذا کے طور پر آلو کے استعمال سے ساری دنیا کے عوام واقف ہیں اس طرح آلو کو غذائی اشیا میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ مکا، گیہوں اور چاول کے بعد آلو دنیا کی چوتھی سب سے اہم غذائی فصل میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن آج سے چار سو سال قبل دنیا کے زیادہ تر حصوں میں سبزی کے طور پر آلو کے نام سے کوئی واقف نہیں تھا۔ بنیادی طور پر آلو ہندوستان کی فصل نہیں ہے اور اسے ہندوستان کی زراعت میں شامل ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔ آلو اصل میں دکنی امریکہ کا پودا ہے۔ یہ انڈیز کی پہاڑیوں میں پہلی مرتبہ اُگایا گیا تھا۔ اس کے ثبوت موجود ہیں کہ آج سے تقریباً آٹھ ہزار سال قبل ٹی ٹی کا کا نامی جھیل کے قریب انڈیز پہاڑی علاقوں میں سمندری سطح سے تقریباً ساڑھے تین ہزار میٹر کی اونچائی پر آلو کی فصل اُگائی گئی تھی۔ یہ علاقہ بولی ویا اور پیرو کے سرحدی علاقے میں آتا ہے۔ آج دکنی امریکہ میں آلو کی تقریباً دو سو قسمیں پائی جاتی ہیں۔ آلو اپنی متعدد شکلوں میں عام آدمی کی غذا کا ایک حصہ رہا ہے اور آج آلو پوری دنیا میں پھیل گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ آج تقریباً دو سو ممالک میں آلو کی کاشت ہوتی ہے۔

ہندوستان میں آلو کی آمد کی ایک دلچسپ تاریخ ہے۔ اس کو ہندوستان تک پہنچانے میں پرتگالیوں کا اہم کردار رہا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سولھویں صدی کے آخر میں یا سترھویں صدی کے شروع میں پرتگالیوں کے ذریعے آلو ہندوستان لایا گیا۔ اب ہندوستان ساری دنیا میں تیسرا سب سے بڑا آلو کی پیداوار والا ملک ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 8-2007 کے دوران آلو کی کل پیداوار ایک کروڑ بیس لاکھ ٹن سے زیادہ رہی ہے۔ اتر پردیش میں آلو کی زیادہ پیداوار کے لیے جونپور اور فرخ آباد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مغل دور میں ہندوستان کے اتری حصوں میں آلو کی موجودگی کا ذکر ملتا ہے جبکہ اس وقت آلو کی فصل عام نہیں تھی۔ شملہ کے مرکزی آلو تحقیقی مرکز کے سائنسدانوں کا خیال ہے کہ آلو کی ہندوستان میں کاشت 1822 میں شروع ہوئی جب چنئی میں ایک آلو کا فارم قائم کیا گیا۔ ملکی سائنسدانوں نے آلو کی اب تک کوئی چالیس سے زائد قسمیں دریافت کر لی ہیں جس سے آلو کو ملک میں ایک اہم مقام حاصل ہو گیا ہے اور اس کی کاشت اتر پردیش، مغربی بنگال، پنجاب، بہار میں کی جا رہی ہے۔

آلو اپنے ذائقے اور غذائی خصوصیت کی وجہ سے دنیا میں چاول گیہوں اور مکا کے بعد دنیا کی سب سے زیادہ استعمال میں آنے والی غذا ہے۔ آلو میں کثیر مقدار میں کاربوہائیڈریٹ، پروٹین، معدنی اجزا اور حیاتین پائے جاتے ہیں۔ آلو میں امینو ایسڈ مثلاً ٹریپٹوفین، لیوسین، آئیسولیوسین کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں جو جسمانی نشو ونما کے لیے نہایت اہم ہیں۔ اس کے علاوہ کیلشیم، پوٹیشیم، فاسفورس، لوہا، تھایمین، رائبوفلیوین اور اسکاربک ایسڈ کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ آلو سب سے بہتر نباتاتی پروٹین کا ذریعہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اگر کوئی شخص ہر روز تین کیلوگرام آلو کا استعمال کرتا ہے تو اس کی ہر روز کی صرف ہونے والی توانائی پوری ہو جاتی ہے۔

آلو ترقی پذیر ممالک میں کچھ غلط فہمیوں کی وجہ سے ابھی پوری طرح استعمال نہیں ہو پا رہا ہے۔ ان کو دور کرنا ضروری ہے۔ مثلاً کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آلو کے استعمال سے جسم کا وزن بڑھتا ہے۔ اس میں زیادہ سچائی نہیں ہے کیونکہ آلو میں صرف ا۔ء فیصد چربی ہوتی ہے۔ بلکہ آلو کے استعمال سے جسم میں چربی بڑھنے کی وجہ آلو کو تلنے اور پکانے میں استعمال میں لائی گئی چکنائی ہے۔ اس طرح یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آلو کے استعمال سے ذیابیطس کا مرض ہونے کا ڈر رہتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس مغربی ممالک کے ڈاکٹر ذیابیطس کے مریضوں کو کم کیلوری والی غذا کے لیے آلو کے استعمال کی رائے دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آلو میں اَلکیلائیڈ، سولونین نامی عنصر پایا جاتا ہے جو جسمانی نشو ونما کے لیے نقصاندہ ہے جبکہ یہ نقصاندہ عنصر آلو کے ہرے حصوں میں ہوتا ہے، جن کا استعمال لوگ عام طور پر نہیں کرتے۔ یہ بھی خیال لوگوں میں موجود ہے کہ غذائی اشیا میں گوشت اور دودھ کے مقابلے میں آلو میں بہت کم مقدار میں جسمانی نشو ونما کے عنصر ہوتے ہیں جبکہ تجربات سے یہ بات سامنے آچکی ہے کہ آلو میں جسمانی نشو ونما کے عنصر دوسری غذائی اشیا سے کم نہیں ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں آلو کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے ہندوستان میں بھی اس کا استعمال بڑھا ہے۔ آلو سے ٹکی، چپس، بے بی فوڈ، ساس، سوپ، آلو آٹا، گرینولس، وغیرہ خاص طور پر تیار کیے جا رہے ہیں۔ آلو کا آٹا بسکٹ کی تیاری میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ آلو کا استعمال سموسا، پیٹیز اور ڈوسا وغیرہ فاسٹ فوڈ بنانے میں کیا جا رہا ہے۔ اس طرح ماہرین کے اندازے کے مطابق غذائی اشیا کی تیاری میں آلو کا استعمال تقریباً چھ فیصد تک پہنچ جاتا ہے۔

آلو کی فصل مزدوروں کی کھپت کو بھی بڑھاتی ہے۔ اس طرح روزگار بڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ آلو کی کاشت ملک کے مختلف حصوں میں کی جا سکتی ہے اور کی جا رہی ہے جن سے پورے سال آلو بازار میں دستیاب رہتے ہیں ایشیا اور افریقہ میں بڑھتی ہوئی آبادی کے مدِ نظر آلو کے غذائی استعمال سے غذائی مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے۔

❑❑❑

پتہ:
Scientist, H 51 DR Iqbal Lane,
Batla House, Jamia Nagar, New Delhi-110025

کائی گوگ لیوٹا

چاند پر انسانی بقا کا سوال

جب 1969 میں نیل آرم اسٹرانگ نے "انسانیت کے لیے لمبی جست" لگا کر چاند کی سطح پر اپنے قدم رکھے تھے، تب ان کے جوتوں میں بند پاؤں، نرم بھوری دھول کی تہہ میں دھنس گئے تھے۔ ان جوتوں کا نقش تاریخ میں انتہائی اہم تصویروں میں سے ایک تصویر کا موضوع بنا رہے گا۔ سائنسداں اس دھول کو چاند کا سنگی کمبل (ریگولتھ) کہتے ہیں۔ یہ ریگولتھ دو یونانی لفظوں ریگوز (کمبل) اور لیتھوز (پتھر) کا مرکب ہے۔ اس کے علاوہ سائنس دانوں نے چاند کے اس سنگی کمبل کو صرف پیش منظر کا حصہ قرار دیا۔ یہ امریکی پرچم نصب کرنے کے لیے پس منظر سے زیادہ کچھ نہیں۔

لیکن اب ایسا نہیں۔ اس کے بعد سے قمری سائنس دانوں نے چاند کے بارے میں بہت کچھ نئی معلومات حاصل کی ہیں۔ انھیں معلوم ہوا ہے کہ چاند پر بستیاں آباد کرنے کی راہ میں، نئے راکٹ تیار کرنے یا تابکاری جیسے پریشان کن معاملات ہی کی طرح کٹھن معاملہ یہ ہے کہ اس سنگی کمبل کے ساتھ کیسے زندگی کے دن رات گزارے جائیں جو کہ چاند کی پوری سطح پر تقریباً ہر جگہ پھیلا ہوا ہے اور اگر کہیں اس کی گہرائی 2 میٹر ہے تو کہیں 30 میٹر، یا کچھ زیادہ۔ اس سنگی کمبل میں بڑی بڑی پتھریلی چٹانوں سے لے کر بہت چھوٹے ذرات تک سب کچھ شامل ہیں لیکن اس میں سے بیشتر سنی ہوئی دھول ہے جو فضا سے چاند کی سرزمین پر 3 بلین سال سے بھی زائد وقت سے بے روک ٹوک ٹکراتے رہنے والے انتہائی تیز رفتار چھوٹے چھوٹے شہاب ثاقب کے چور چور ہو جانے کی پیداوار ہے۔ مٹھی بھر سنگی کمبل میں پتھر بھی ہوتے ہیں، معدنیات بھی اور چھوٹے چھوٹے تصادمات کی گرمی سے بننے والے شیشہ کے ٹکڑے اور کہیں کہیں دھات اور پتھر کا مجموعہ بھی۔ پگھلنے، ٹھنڈا ہونے اور یکجا ہو جانے کی اذیت نے سنگی کمبل میں شامل شیشے کے ذروں کو ایک تیز، نوکدار اور جلد میں خراش ڈالنے والے سفوف میں بدل دیا ہے اور یہ سفوف جس چیز سے مس ہوتا ہے اس سے چپک جاتا ہے اور اتنی شدت سے سنتا اور چپکتا ہے کہ دس سینٹی میٹر سے نیچے کسی گہرائی میں کام کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

جو لوگ مریخ کی تلاش کے لیے، تربیت حاصل کرنے کی غرض سے، وسائل کی کان کنی کے لیے یا بڑے پیمانے پر رسدگاہیں قائم کرنے کے لیے چاند پر جائیں گے ان کے لیے یہ سنگی کمبل مفلوج کر دینے والی شے ثابت ہوگا۔ یہ مشینوں اور انسانی خلیوں کے لیے تباہ کن خطرہ ہے کیونکہ یہ خلیوں کے اندر سرایت کر سکتا ہے۔ چاند پر چہل قدمی کے صرف تین دنوں میں اس سنگی کمبل نے اپولو کے خلابازوں کے خلائی سوٹ میں جوڑوں کو جکڑ لیا تھا۔ چاند کی چٹانوں پر اپولو کو روکنے کے لیے نمونے کے جو خصوصی چوکھٹے بنائے گئے تھے ان کی ویکیم سیل اسی دھول کی وجہ سے کناروں کے خراب ہونے کے سبب ٹوٹ گئی۔ چاند پر کوئی مستقل اڈہ بنانے کی کوشش کے دوران ایسی کوئی مشینی ناکامی ہوئی تو بڑی تباہی پھیلے گی۔ یہ سنگی کمبل آب رسانی کو تباہ کر سکتا ہے، سوئچوں کو اس طرح منجمد کر سکتا ہے کہ انھیں آن آف نہیں کیا جا سکے اور بال بیئرنگس کو گریپ نٹس (ناشتے میں استعمال ہونے والی کھانے کی ایک چیز) میں بدل سکتا ہے۔ جب چاند کی سطح پر موجود دھول کو اڑایا جاتا ہے تو چھوٹے چھوٹے ذرات تیرتے ہیں، پھر آگے سطح پر گرتے ہیں اور ہر چیز کے ساتھ چپک جاتے ہیں۔ ریگولتھ آسانی سے نہیں چھوٹتا اور اگر یہ سانس کے ذریعے نتھنوں سے اندر پہنچ جائے تو پھیپھڑوں میں سرایت کر جاتا ہے اور اس سے پلمونری فائبروسس جیسا پھیپھڑوں کا مرض لاحق ہوتا ہے جو کہ بلیک لنس (سیاہ پھیپھڑوں) کا قمری متبادل ہے۔ ہماری دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس سنگی کمبل جیسی ہو۔ ناسا کے مارشل اسپیس فلائٹ سینٹر کے ماہر ارضیات ڈگلس رکمین کا کہنا ہے کہ "یہاں زمین پر ایسے ارضیاتی عمل جاری رہتے ہیں جو چیزوں کو چھانتے اور الگ کرتے رہتے ہیں۔ جب کہ آج چاند پر جو شہابی اثرات موجود ہیں جو ہر چیز کو ملا دیتے ہیں۔"

تاہم خلائی منصوبہ سازوں کی نظر میں اس کہانی کا ایک زیادہ روشن پہلو بھی ہے۔ سنگی کمبل میں 22 فیصد آکسیجن ہے۔ اس کو اگر نکال لیں تو وہاں کی فضا بھی سانس لینے کے قابل ہو جائے گی، راکٹ میں استعمال ہونے والا ایندھن بھی حاصل ہو سکے گا اور جب اسی آکسیجن میں ہائیڈروجن ملا دیں گے تو پانی بن جائے گا۔ اس سنگی کمبل کو اگر گرم کر دیں تو یہ سخت ہو کر فٹ پاتھ بن جائے گا، اینٹ بن جائے گا، سفال گری کا نمونہ بن جائے گا۔ حتیٰ کہ اس سے بجلی پیدا کرنے کے لائق شمسی پینل بھی بن سکتے ہیں۔ کسی رہائشی علاقہ کو اگر اس سنگی کمبل کی موٹی تہہ سے ڈھک دیا جائے تو خلاباز اس علاقہ میں تابکاری سے محفوظ

رہ کر دن رات گزار سکیں گے۔ اس طرح دیکھا جائے تو یہ تنگی کمبن چاند کے انکشاف کی ایک لعنت ہے تو یہ ایک رحمت بھی ثابت ہوسکتا ہے۔

یہ سارے معاملات جنوری 2004 میں ختم ہونے والی تین دہائیوں تک خوابیدہ پڑے تھے۔ اس وقت صدر جارج ڈبلیو بش نے خلائی انکشاف کے لیے اپنے وژن کا اعلان کیا اور ناسا کو نیا حکم دیا: 2020 تک انسانوں کو چاند پر واپس بھیجیں اور وہاں سے انھیں مریخ پر بھیجیں۔ اس منصوبے کی نئی تفصیلات ٹکساس کے شہر ہیوسٹن میں امریکن انسٹی ٹیوٹ آف ایرونوٹکس اینڈ ایسٹرونوٹکس کی ایک میٹنگ میں دسمبر 2006 میں سامنے آئیں۔ سائنس داں اس وقت یہ سوچ رہے ہیں کہ اس وژن کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے کیا کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ چاند کے انکشاف کو برقرار رکھنے کے سیاسی عزم کے بارے میں ایک بحث چل رہی ہے لیکن تکنیکی دشواریاں اس تنازع سے اوپر ہیں۔ چاند پر اب جو اگلا شخص قدم رکھے گا وہ انسانیت کو ایک ایسی جگہ لے جائے گا جہاں وہ پہلے کبھی نہیں پہنچی تھی۔ کیونکہ وہ شخص چاند پر قیام کے لیے اترے گا اور یہ کام بہت مشکل ہوگا۔ ناسا نے اس وقت جو منصوبہ بنایا ہے، اس کی ٹکنالوجی کے تحت جانچ اور اطلاعات جمع کرنے کے لیے چاند پر پیشرو روبوٹ مشن بھیجے جائیں گے۔ یہ مشن 2008 کے آخری دنوں میں شروع ہوں گے۔ یعنی ناسا کے نیو اورین خلائی جہاز کے تیار ہونے سے بہت قبل۔ یہ خلائی جہاز چار خلابازوں کو لے کر چاند کی طرف پرواز کرنے والا ہے۔ منصوبہ بنانے والوں کو امید ہے کہ جب تک یہ کام ہوگا وہ بعض کلیدی نامعلوم چیزوں کو دریافت کرلیں گے۔ جیسے کہ یہ معلوم کرلیں گے کہ کیا چاند کے دونوں قطبوں میں سے کسی ایک قطب میں برف کا ذخیرہ ہے؟ کیا ایک ایسا خلائی سوٹ تیار کیا جاسکتا ہے جو گرد سے ڈھکی ہوئی قمری سطح پر ایک سے زیادہ سفر کی شدت جھیل سکے؟ اور کیا انسانی جسم اس گرد کے ساتھ بھی زندہ رہ سکتا ہے؟ کم کشش ثقل میں زیادہ دنوں تک قیام کرسکتا ہے اور کائناتی تابکاری کو زیادہ دنوں تک جھیل سکتا ہے؟ ابتدائی پھیروں میں اپولو کے طرز کے چھوٹے چھوٹے چکر ہوں گے۔ تکنیک اور آلات کی جانچ کے لیے مختصر دورے اور ایک چوکی تعمیر کرنے کا آغاز۔ شروع میں اس اڈے پر کچھ رہائشی گھر بنائے جائیں گے، ایک لانچ پیڈ تیار کیا جائے گا، ایندھن اور دیگر ضروری اشیا کو جمع کرنے کی ایک سہولت تیار کی جائے گی اور بجلی کا کارخانہ لگایا جائے گا۔ ناسا کے ماہرین کو امید ہے کہ 2024 تک وہ اتنا خاطر خواہ بنیادی ڈھانچہ چاند کی سطح پر بنالیں گے جس کی مدد سے چاند پر انسان مستقلاً کچھ دن رہ سکے۔

چاند پر ایک مستقل چوکی کا قیام مریخ پر چوکی بنانے کے مقابلے میں کئی اعتبار سے زیادہ مشکل کام ہے۔ زمین کی طرح مریخ پر ایک فضا ہے وہاں ایک آب وہوا ہے، بدلتے ہوئے موسم ہیں اور وہاں کی کششِ ثقل زمین کی کششِ ثقل سے ایک تہائی ہے۔ جب کہ چاند کی کششِ ثقل زمین کی کششِ ثقل سے چھ گنا کم ہے۔ وہاں کوئی فضا نہیں اور ایک بے رحم لامتناہی تابکاری اور چھوٹے احجار شہابی کے، چاند کی سطح سے ٹکراتے رہنے کا سلسلہ ہے۔ بعض سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ہمارا آخری مقصد اگر مریخ پر جانا ہے تو چاند پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

لیکن اگر خلا میں بہت زیادہ دنوں تک قیام کے بارے میں جاننا ہمارا مقصد ہے تو چاند پر جانے سے بہتر کوئی اور صورت نہیں۔ اس صورت میں خلائی اسٹیشن کے خلاباز زمین کے نچلے مدار میں اور دنیا سے صرف 360 کلومیٹر کی دوری پر ہوں گے۔ چاند پر موجود خلابازوں کو کسی بھی طرح کی مدد کی ضرورت پڑے تو صرف تین دن کے اندر مدد پہنچائی جاسکتی ہے۔ جب کہ مریخ کے خلابازوں تک مدد پہنچنے میں مہینوں لگ سکتے ہیں۔ یعنی جو کم از کم وقت لگے گا وہ بھی ایک راکٹ مریخ پر بھیجنے کی تیاریوں کے برابر وقت ہوگا۔ ان خلابازوں کو نہ صرف بہت زیادہ دنوں تک محدود خلا میں، گھٹی ہوئی کشش ثقل کے اندر رہنا سیکھنا ہوگا جیسا کہ خلائی اسٹیشن کے بہت ہوشیاری سے تیار کیے گئے دروں خانہ ماحول میں رہنا پڑتا ہے، بلکہ ان پر یہ بھی لازمی ہوگا کہ وہ زیادہ دنوں تک اس اسٹیشن سے باہر ممکنہ ہلاکت خیز ماحول میں کام کرنے پر بھی مجبور ہوں اور یہ ایسا ماحول ہے جو ان کے کنٹرول سے باہر ہے۔ ان پر لازمی ہوگا کہ وہ استعمال کرنے کے لائق چیزیں جیسے کہ آکسیجن بنائیں، ان کو ردّی سے کارآمد بنانے کے لیے ری سائیکل کریں اور فضلات کو بھی کارآمد بنائیں۔ ان کے لیے لازمی ہوگا کہ اپنے آلات کو ہمیشہ بالکل ٹھیک ٹھاک رکھیں اور اس بات سے اچھی طرح واقف رہیں کہ وہ جو مرمت کا کام کریں گے اس پر نہ صرف ان کے سائنسی مشن کا بلکہ ان کی زندگیوں کا بھی دار و مدار ہوگا۔

ان چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے رویہ میں تبدیلی لانے کی اور کافی مشق کرنے کی ضرورت پڑے گی اور یہ ضروری ہوگا کہ غلطیوں کو گھر کے قریب ہی دور کرلیا جائے۔ سابق خلاباز اور امریکی سینیٹ کے ممبر ہیریسن اشمیٹ نے (جو چاند پر چہل قدمی کرنے والے بارہ افراد میں سے ایک ہیں) ناسا کے زیر اہتمام چاند کانفرنس کے مندوبین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "انسانیت کے لیے ضروری ہے کہ وہ از سرِ نو ایک گہرا خلائی عملی ڈھانچہ اور ڈسپلن تیار کرے" دوسرے لوگ اس صورت حال کو زیادہ صفائی سے بیان کرتے ہیں۔ خلائی شٹل چیلنجر اور کولمبیا کی تباہی کے بعد ناسا محتاط ہوگیا ہے اور خطرات کے معاملے میں بھی اب زیادہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں۔

یونیورسٹی آف ٹینیسی میں ارضی کیمیاداں اور ممتاز قمری سائنس داں لارنس ٹیلر کا کہنا ہے کہ ”کچھ چیزوں کا فیصلہ ہمیں کرنا ہوگا۔ مشکل آنے والی ہے۔ اگر ہمیں لگتا ہے کہ چاند پر جانا خطرناک ہے تو مریخ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ایسا نہیں ہے کہ آپ ہاتھ جھاڑ کر گھر چلے جائیں۔“

تیز، نوکدار اور جلد میں خراش ڈالنے والے سفوف پر مشتمل سنگی کمبل چاند کے سخت ماحولیات کا صرف ایک پہلو ہے۔ خطِ استوا مقابلتاً زیادہ چکنی سطح پر راکٹ کے بہ عافیت لینڈنگ میں معاون ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ دن کے وقت چاند کے درجۂ حرارت 121 ڈگری سلسیس ہوتا ہے اور رات کو گھٹتے گھٹتے منفی 151 ڈگری سلسیس تک پہنچ جاتا ہے۔ چاند کا ایک دن 114 ارضی راتوں کے برابر۔ اپولو کے خلابازوں کو جو کچھ کرنا تھا انھوں نے قمری علی الصبح یا پھر دوپہر سے پہلے کے اوقات میں کیا۔ اس وقت روشنی اتنی ضرور ہوتی ہے کہ بہت کچھ دیکھا جاسکے مگر گرمی اتنی نہیں ہوتی۔

آب و ہوا ہی وہ اصل سبب ہے جس کی بنا پر ناسا نے دسمبر 2006 کے اوائل میں اس بات کا اعلان کیا کہ وہ چاند کے قطبین کے قریب ایک چوکی تعمیر کرے گا۔ اس وقت اس کام کے لیے سب سے پسندیدہ جگہ چاند کے جنوبی قطب پر شیکلٹن شگاف کے بالکل آخری سرے پر ہے جہاں کا درجہ حرارت اعتدال پر یعنی منفی 40 ڈگری اور 10 ڈگری سیلسیس کے درمیان ہوتا ہے۔ شیکلٹن کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ وہاں دھوپ ملتی ہے۔ بے شک زیادہ تیز نہیں۔ سال کے 80 فیصد دنوں میں یہ ہلکی دھوپ دستیاب ہے۔ بجلی پیدا کرنے کے لیے وافر روشنی کی ضرورت ہے اگر یہ چوکی قمری خطِ استوا کے قریب بنائی جائے تو یہ مہینہ کے پندرہ دن اندھیرے میں رہے گی۔ ان دنوں میں شمسی توانائی جمع کرنے والے آلات بےکار پڑے ہوں گے۔

چاند کے قطبین کی ایک اور اہم دلکشی یہ ہے کہ وہاں پر کارآمد قدرتی وسائل کا ذخیرہ موجود ہے۔ 1990 میں چاند کے مدار کے گرد گھومنے والے خلابازوں نے ہائیڈروجن کے ذخیرے کا پتہ لگایا جو کہ راکٹ کو چلانے والے ایندھن کا ممکنہ ذریعہ بن سکتا ہے۔ فی الحال کسی کو نہیں معلوم کہ وہاں کتنا ہائیڈروجن ہے اور کس شکل میں ہے۔ کچھ سائنس دانوں کو پتہ ہے کہ بہت قبل ایک دمدار ستارہ چاند سے ٹکرایا اور مستقل چھاؤں میں چھپے ہوئے شگاف کے اندر پانی اور برف کو دفن کر گیا۔ ہائیڈروجن کے ذریعے کی نشاندہی روبوٹ بھیجنے کے مشنوں کا کلیدی مقصد ہے۔ یہ روبوٹ انسانوں کے اگلی بار چاند پر قدم رکھنے سے پہلے بھیجے جائیں گے۔ چاند پر راکٹ کے اترنے کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ چاند کی سطح زیادہ ناہموار ہے اور چاند کے درمیانی خطے کے مقابلے میں زیادہ بدقطع بھی، جس کی وجہ سے راکٹ کا اترنا زیادہ خطرناک ہوجاتا ہے۔ اس کے باوجود ناسا کے افسروں کو یقین ہے کہ جنوبی قطب پر جو سہولتیں حاصل ہیں وہ تمام خطرات کو کم کر دیتی ہیں۔ چوکی چاہے جہاں بنائی جائے یہ طے ہے کہ طویل قمری مشن پر جانے والے خلابازوں کو گھٹی ہوئی کششِ ثقل اور تابکاری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مختصر وقت کے لیے ابتدائی چاند مشنوں کے دوران کم کششِ ثقل کے عضلات اور ہڈیوں کو کمزور کرنے والے اثرات بڑا مسئلہ پیدا نہیں کریں گے لیکن خلابازوں کو تابکاری کے زیرِ اثر آنے سے بچانا فوری فکرمندی کا باعث ہوگا۔

اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ قمری چوکی کو تابکاری جذب کرنے والے پانی میں ملفوف کردیا جائے۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ بدترین شعاعوں کو ٹکرا کر واپس جانے پر مجبور کرنے کے لیے ایک مصنوعی مقناطیسی دیوار کھڑی کی جائے لیکن شاید سب سے آسان حل یہ ہے کہ اس سنگی کمبل سے ہی کام لیا جائے یعنی کسی غار کے اندر مسکن بنائے جائیں اور انھیں قمری گرد کی ایک موٹی سی تہہ میں ڈھک دیا جائے۔

اس کے لیے کتنی سنگی گرد کی ضرورت پڑے گی؟ کسی کو نہیں معلوم۔ یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ چاند کی سرزمین کی سطح کے نیچے تابکاری سے مسلسل ردِعمل ہوتے رہیں گے۔ ثانوی ردِعمل کی وارداتوں سے خلیے تقسیم ہوں گے جو کہ انسانی خلیوں کے لیے کھلی ہوئی بمباری سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ ٹیلر کا خیال ہے کہ خلابازوں کو تابکاری سے محفوظ رکھنے کے لیے دس فٹ یا تین میٹر مٹی یا اس سے بھی زیادہ مٹی کی ضرورت پڑے گی۔

اس لیے خلابازوں کو اس سنگی مٹی کی کھدائی کرنی پڑے گی۔ یہ سننے میں آسان ہے عمل کرنے میں مشکل۔ سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ بھاری آلات کو کیسے خلا میں پہنچایا جائے۔ قمری تعمیرات کے پرانے طالب علم اور مڈل ٹینیسی اسٹیٹ یونیورسٹی میں سول انجینئر والٹر ویسلے بولس کا کہنا ہے کہ ”ہم لوگ 90,700 کلوگرام وزنی بلڈوزر کو چاند پر نہیں بھیج سکتے۔ کسی طرح بھیج دیا تو وہاں یہ بلڈوزر ٹھیک سے کام نہیں کریں گے۔ انجینئروں کو چھوٹے اوزار کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ چاند کی زمین پر سنگی کمبل کو ہٹانے کے لیے ہمیں ایسے چھوٹے چھوٹے بلڈوزر بنانے پڑیں گے جو گھڑسواری کے میدان میں گھاس کاٹنے کے استعمال میں آتے ہیں۔“ ناسا نے 2007 میں سنگی کمبل کی کھدائی کا مقابلہ کرایا اور اس کا اعلان کیا کہ جس کے روبوٹ 30 منٹ کے اندر سب سے زیادہ سنگی کمبل کھود سکیں گے اس کو 50,000 ڈالر انعام میں دیا جائے گا لیکن کھدائی کے لیے جو چیز استعمال ہو اس کا وزن 40 کلوگرام سے زیادہ نہ ہو۔

(افسوس کی بات ہے کہ یہ انعام کوئی نہیں جیت سکا۔)

اس کے علاوہ علم طبعیات کے کچھ اور بنیادی سوالات بھی ہیں۔ زمین پر جو بھاری مشینیں کام کرتی ہیں ان کا دارومدار رکاوٹ اور کشش ثقل پر ہوتا ہے۔ جس سے انھیں مستحکم طریقے سے کھڑے رہ کر اپنا کام کرنے یعنی کاٹنے، ڈھکیلنے، کھینچنے، کھودنے، کترن ہٹانے یا پیٹنے کوٹنے میں مدد ملتی ہے۔ چاند پر جمود کی کیفیت ایک جیسی ہے۔ یہ مادّے کی ایسی خاصیت ہے جس میں وہ اگر خارجی قوتوں سے متاثر نہ ہو تو ساکت رہے گا۔ کسی چیز کو ٹھوکر مارو اور وہ زمین پر استعمال ہونے والے اسی خطِ حامل کے ساتھ حرکت میں آجاتی ہے لیکن کششِ ثقل مختلف ہے۔ زیادہ شدت سے کام کرو تو مشین کودنے لگتی ہے۔ زیادہ تیزی سے گھماؤ تو مشین لڑھک جاتی ہے۔

ایک حل یہ ہے کہ شدت سے کھدائی شروع کرنے سے پہلے بلڈوزر کی پشت پر ایک بڑی ٹوکری بنائی جائے اور اس کو سنگی کمبل سے بھر دیا جائے تاکہ توازن قائم کرنے سے پہلے بلڈوزر کو چھید کرنے کے لیے اسکریو پوائنٹ کے ساتھ جوڑ دیا جائے تاکہ یہ قمری سطح پر دھیرے دھیرے اسکریو کی طرح دھنستا چلا جائے۔ بولس کا مشورہ ہے کہ بلیڈ کے طور پر استعمال ہونے والی آہنی پتیوں سے بھی نجات حاصل کرلی جائے اور اس کی جگہ برش یا تعمیرات کے دوران مٹی اٹھانے والے سوپر لگائے جائیں تاکہ قوت کا استعمال کم ہو اور وہ ایک وقت میں سنگی کمبل کی ایک پتلی سی تہہ کو چھیل لے۔

چاند پر کھدائی کے دوران یہ ممکن ہے کہ خلاباز، خاص کر اگر وہ سوپر استعمال کر رہے ہوں تو، گرد سے اَٹ جائیں گے۔ مشینوں اور آلات پر انسان کی پیدا کردہ سنگی گرد سے ہم تب سے واقف ہیں جب سے قریب ہی کھڑے لاوارث پرانے سرویر تھری خلائی طیارے پر اپولو کے بارہ انجنوں سے ریت کے فوارے چھوڑے گئے تھے جس کے بعد یہی دھول اڑی تھی۔ قمری وسائل کو استعمال کرنے کی تکنیک ایجاد کرنے سے متعلق ناسا کی کوششوں کے پروگرام منیجر اور ممتاز سائنس داں کینیڈی اسپیس سینٹر سے وابستہ ویلین لارسن کا کہنا ہے کہ ''ان لوگوں نے چاند کی گرد ایک ایک گوشے اور دراڑ، شگاف اور وزن میں دیکھی ہے۔'' ہر آرٹسٹ نے چاند پر چوکی کا جو بھی تصوراتی نقشہ بنایا ہے اس میں سنگی کمبل کے پہاڑ دکھائے ہیں۔ جو لانچ پیڈ پر راکٹ کے اترنے سے اڑنے والی گرد سے اہم آلات اور اڈے کو ڈھک دیں گے۔

ناسا کے جدید ترین خلائی سوٹ کی تیاری میں بھی ایک حل طلب مسئلہ چاند کی گرد کا ہے۔ اپولو مشنوں کے دوران چاند پر تین روز تک کے قیام کی حد اس لیے لگائی گئی تھی کہ تین دن کے اندر چیزوں کو جوڑنے اور کسنے والے شکنجے، جن کو زِپر کہا جاتا ہے، بیکار ہوجاتے ہیں، جوڑ سخت ہوجاتے ہیں اور آلات کو جوڑنے والے کنکڑوں میں رکاوٹ آنے لگتی ہے۔ نئے خلابازوں کو ایک ایسا حل نکالنا پڑے گا جو انھیں وہاں کام کرنے کا اہل بنا سکے۔ جانسن اسپیس سینٹر میں ترقی یافتہ جدید ترین خلائی سوٹ انجینئر ایمی راس کا کہنا ہے کہ ''اب ہم لوگ (جوڑوں میں) سیل کی جگہ بال بیرنگ استعمال کریں گے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہم اس کی طرف سے بالکل غافل ہوجائیں اور دیکھ بھال کی ضرورت بالکل ختم ہوجائے لیکن ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ خلابازوں کا خالی وقت مینٹیننس میں کٹ جائے۔'' خلائی انجینئر اب بھی اس پر بحث کر رہے ہیں کہ کیا خلابازوں کو گندے کام کرنے کے لیے ایسی پوشاک پہننے پر مجبور کیا جائے جو مجموعی ہو اور ایک ایسا ''گرد پورچ'' بنایا جائے جہاں یہ خلاباز اپنے آپ کو صاف ستھرا کرکے رہائشی کوارٹروں میں داخل ہوسکیں۔ وہ لوگ اس کوشش میں بھی ہیں کہ کسی طرح کا ایسا سوٹ بنالیا جائے جو کہ آسانی سے نہ کٹ سکے، نہ گھس سکے اور اس کے باوجود زمین پر اس کا وزن 91 کلو اور چاند پر 15 کلو سے زیادہ نہ ہو۔ راس کے مطابق ''یہ کافی مشکل کام ہے۔''

ان تمام خطرات کے باوجود سنگی کمبل کے مسئلے کا ایک حل ہے۔ جو صرف تابکاری کو روکنے کے لیے نہیں بلکہ چاند پر اپنی تمام ضرورتوں کی تکمیل کرنے والی چوکی کے لیے تعمیراتی ساز و سامان بھی فراہم کرنے کا اہل ہے۔ اصل کلید قمری مٹی میں شیشے اور دھات کے آہنی ذرات میں ہے۔ 1990 کی دہائی میں یونیورسٹی آف ٹینیسی کے لارنس ٹیلر نے یہ دکھایا کہ سنگی کمبل کے عمدہ ترین نمونوں میں اس مادہ کو کارآمد بنانے کے بہت سے امکانات موجود ہیں۔ انھوں نے یاد کیا کہ ''ایک رات میں سیڑھیوں سے نیچے گیا اور میں نے تھوڑا سا سنگی کمبل اپنے مائکروویو سے چپکالی۔ میرے پاس اس کا کوئی سبب نہیں تھا۔ برسوں پہلے اسے آزمایا جاچکا تھا اور یہ کارگر نہیں ہوا تھا۔ اس بار یہ چپک گیا۔'' ٹیلر نے یہ پتہ لگایا کہ وہ دس سے بیس سیکنڈ میں قمری مٹی کے ڈھیر کو پگھلا سکتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی ساری توجہ دوسرے سیمپل میں واحد میگ نیٹرون پر مرکوز کردی۔ انھوں نے بتایا کہ ''پچاس واٹ کی توانائی سے میں نے چاند کی مٹی کے ایک سینٹی میٹر ٹکڑے کو دس سیکنڈ میں 1700 ڈگری سیلسیس تک گرم کیا۔''

اس کا جو نتیجہ نکلا اس کے مضمرات بہت شدید ثابت ہوئے۔ قمری مٹی کو مائکروویو میں ڈال کر خلاباز اس کے ذرات کو اس طرح ڈھال سکتے ہیں کہ کام کے لائق بنیاد قائم ہوجائے۔'' اگر درجہ حرارت سے اس سے بھی زیادہ بڑھایا جائے تو بالائی تہہ پگھل جائے گی اور ایک سخت شیشے میں تبدیل ہوجائے گی۔ اس سے نہ صرف خلابازوں کو فوری طور پر شاہراہ مل جائے گی بلکہ وہ گرد کے

بدترین بادلوں کو کم کرسکیں گے۔ چاند میں سنگی کمبل اپنے آپ ادھر ادھر نہیں اڑتا۔ انسانی قدم یا ٹائر ان میں ہلچل مچاتا ہے اور اگر یہ لوگ فٹ پاتھ پر چل رہے ہوں تو گرد رک جاتی ہے۔

ٹیلر کا خیال یہ ہے کہ قمری مائیکرو ویو مشین ایکن، ''زام بونی'' یعنی ہاکی کے پچ میں برف ہٹانے والی مشین کی طرح ہونی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ''میں میگ نیٹرون کے پہلے سیٹ کے ساتھ مٹی کے اندر ایک فٹ گہرا گڈھا کھود سکتا ہوں اور اس کے بعد دوسرے سیٹ سے اوپر کے دو انچ کو پگھلا کر شیشے میں بدل سکتا ہوں۔''

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ لاک ہیڈ مارٹن ایک ایسا پلان بنا رہے ہیں جو سنگی کمبل سے آکسیجن کشید کر سکے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کسی بھی خلائی انجینئر کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔ رقیق آکسیجن کسی بھی طیارے کے ایندھن کے ذخیرہ میں 75 فیصد سے 80 فیصد تک ہوتی ہے۔ اگر زمین سے فاضل آکسیجن لے کر آنے کی ضرورت نہ پڑے تو لانچ ویکل اور ہلکی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ پرواز سستی بھی ہو سکتی ہے، جس کی بنا پر اس ویکل پر لوڈ بڑھایا جا سکتا ہے۔ کلارک نے بتایا کہ'' ناسا کی خواہش ہے کہ ہم لوگ ہر سال آٹھ میٹرک ٹن آکسیجن بنائیں۔ یعنی دن کی روشنی میں ہر روز 44 کلو۔ اس طرح ہم لوگ ہر سال دو ایسنٹ ویکلس میں ایندھن پہنچانے کے اہل ہوں گے۔'' کلارک نے 15 سال قبل چاند پر کارخانے لگانے کے بارے میں سوچا تھا اور ایک انتہائی کم تحقیقی بجٹ پر برسوں تک اپنے تصورات کو زندہ رکھا۔ حالات اب بدل گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ڈین ور، کولوریڈو کے جنوب میں واقع لاک ہیڈ کی لیبارٹری میں جو کچھ کیا جا رہا ہے۔'' وہ تجربہ نہیں ہے۔ ہم لوگ اسے اگلی سطح پر لے جا رہے ہیں۔''

قمری زمین سے آکسیجن بنانے کی بہت سی صورتوں میں کلارک نے ہائیڈروجن کم کرنے کے طریقۂ کار کو بہتر سمجھا ہے۔ یہ مقابلتاً کم درجہ حرارت 704 سے 815 ڈگری سیلسیس میں کام کرتا ہے۔ اس کا نقصان یہ ہے کہ اس میں صرف آئرن آکسائڈ سے آکسیجن برآمد ہوتی ہے جو کہ سنگی کمبل میں تقریباً 10 فیصد کے برابر ہے۔ دیگر زیادہ گرم عوامل میں زیادہ آکسیجن نکل سکتی ہے۔ اس کے باوجود کلارک کا اندازہ یہ ہے کہ صرف 5 سینٹی میٹر کی گہرائی اور 84 مربع میٹر کی لمبائی تک سنگی کمبل کی کھدائی سے 300 کلوگرام آکسیجن برآمد ہوگی وہ 75 دن تک 4 خلابازوں کے استعمال کے لیے کافی ہوگی۔ چمچماتے ہوئے ٹائلوں کے فرش سے مزین کلارک کی لیبارٹری اور اچھی دھوپ چاند جیسی نہیں لگتی لیکن ان کی مشینیں اصل چیز ہیں۔ کھدائی کرنے والا ان کا روبوٹ لان پر بجلی سے چلنے اور گھاس کاٹنے والی مشین کے سائز کا ہے۔ اس میں فولاد کے ڈرم لگے ہیں جن پر پتھر اٹھا کر ڈالنے والے کچھ نصب ہیں۔ یعنی ایک ایسے اسٹیم رولر کی شکل بنتی ہے جس میں پیالے لگے ہوئے ہوں۔

جب ٹکنیشین اسٹارٹ بٹن دباتے ہیں تو روبوٹ فرش پر اچھل کر سینڈ باکس تک پہنچتا ہے جو کہ چھ میٹر دوری پر کھڑا ہوتا ہے۔ ڈرم نیچے آجاتے ہیں اور گردش کرنے لگتے ہیں۔ پیالوں میں ریت جمع ہوتی ہے اور روبوٹ کے پلیٹ فارم کی پشت پر ایک ہوپر یعنی پیچوں وغیرہ کو پکڑنے والے چوکور چوبی یا آہنی حلقے کے اندر گرنے لگتی ہے۔ جب ہوپر بھر جاتے ہیں تو روبوٹ ایک مخصوص جگہ پر انھیں خالی کر دیتا ہے اور ریت کو پلاسٹک کی تھیلیوں میں الٹ دیتا ہے۔ روبوٹ کو چھوڑ دیجیے وہ دن بھر کھدائی کر کے ریت اسی طرح جمع کرتا رہے گا۔

آخر میں جب کھدائی کرنے والا روبوٹ خلائی جہاز کے قریب واقع ذخیرے کو بھر دے گا تو ایک مشین، ریت یا مٹی اٹھا کر ری ایکٹر میں ڈال دے گی جو صرف 51 سینٹی میٹر لمبی ہوگی اور اس کی شکل سینٹ مکسر جیسی ہوگی۔ وہاں سنگی کمبل کو گرم کیا جائے اور دباؤ کے تحت گردش دی جائے تو ہائیڈروجن اس کے اندر رسنا شروع کر دے گا۔ 704 ڈگری سیلسیس کے اوپر گرمی ملنے سے آئرن آکسائڈ ٹوٹنے لگتا ہے اور آکسیجن جب ہائیڈروجن سے ملتی ہے تو بخارات نکلنے لگتے ہیں۔ اگر خلابازوں کو پانی کی ضرورت ہے تو یہ کام وہیں روک دیں، اگر نہیں تو بھاپ الیکٹرولیسس کے لیے دوسرے چیمبر میں داخل ہوگی۔ آکسیجن وہاں سے نکال کر قمری اڈے میں بھی لے جائی جا سکتی ہے اور اسٹوریج ٹنکیوں میں بھی ایندھن کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں جب کہ ہائیڈروجن دوبارہ استعمال کے لیے ری ایکٹر میں جمع ہو سکتی ہے۔

کلارک کو امید ہے کہ وہ چند برسوں میں کسی بے انسان قمری پیش رو مشن پر اپنے انتظام کی جانچ کر سکیں گے۔ انھوں نے اپنی فیکٹری میں ہر مشین کو کام میں لگا رکھا ہے اور اب وہ ان پرزوں کو جوڑ کر ایک بے شکن مشین تیار کر رہے ہیں۔ جس کی مدد سے ایک حقیقی آکسیجن پلانٹ بن جائے گا اور اس کارخانے سے چاند پر جانے والے لوگوں کو زمین سے ضروری اشیا خلائی جہاز پر لاد کر لے جانے سے نجات مل جائے گی۔ کلارک نے کہا'' ہر سال خلائی مشن کے منصوبہ ساز آکر یہ کہتے ہیں کہ یہ سچ مچ بہت عمدہ ہے مگر پورا عمل اس سے پہلے کبھی تکمیل تک نہیں پہنچا۔ میں چاہتا ہوں کہ اگلی بار یہ کہہ سکوں کہ لو یہ تیار ہے۔''

(بشکریہ ''آئین'' دہلی)

□□□

خان قمر الزماں

بایوٹیکنالوجی میں کیریئر

B.T. یعنی بایوٹیکنالوجی (Bio-Technology) ایک تحقیقی سائنس ہے۔ جو بائیلوجی پر مشتمل ہے۔ Bio-Technology میں جینیٹکس بایوکیمسٹری، مائیکروبائیلوجی، امیونالوجی، Virology، کیمسٹری جیسے مضامین شامل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ B.T. کا تعلق صحت، ادویات (میڈیسین)، ایگریکلچر، جانور کراپنگ (Cropping) ایکولاجی (Ecology)، خلیات (Cell)، زمین کا تحفظ Bio-Statistics پودوں کی افزائش، بیج (Seeds) کی ٹیکنالوجی وغیرہ شعبوں سے ہوتا ہے۔

B.T. کا استعمال جاندار اشیا، خاص طور سے خلیہ (Cell) اور بیکٹیریا (Bacteria) کے انڈسٹری میں استعمال میں ہوتا ہے B.T. کے کئی فائدوں میں سے خاص فائدے مختلف دواؤں کی ایجاد Vaccines، طریقۂ علاج، توانائی سے تعلق رکھنے والی اشیا کی پیداوار میں اضافہ اور بچاؤ خاص فائدے ہیں۔ ماحولیاتی بایوٹیکنالوجی (B.T. Environment) کے ذریعے آلودگی پر کنٹرول اور بیکار فضول اشیا کے استعمال کی وضاحت جیسے فائدوں کے ساتھ ساتھ B.T. کا اہم رول بیجوں (Sees) کی خصوصیات و پیداوار میں اضافے کا کام ہے۔

پچھلے چند سالوں سے کمپیوٹر، انفارمیشن ٹیکنالوجی الیکٹرونکس و ٹیلی کمیونیکیشن ٹیکنا وغیرہ مضامین کا بول بالا ہے۔ ہر طرف انفارمیشن ٹیکنالوجی (I.T.) ہر ایک کی زبان پر ہے۔ ماہرین کے اندازوں کے مطابق آنے والے 20 سے 30 سال (B.T.) یعنی بایوٹیکنالوجی کے ہوں گے۔ ان برسوں میں ہی پچھلے پانچ برسوں سے I.T. کے ساتھ B.T. کے جڑنے سے ان اندازوں میں B.T. کا سب سے زیادہ استعمال ہونے والا ہے۔ B.T. کا سب سے بڑا مارکیٹ فارمیسی (دوائیوں) کا ہے۔

B.T. میں کیریئر: بایوٹیکنالوجی (B.T.) میں کیریئر بنانے کے لیے بارھویں (10+2) تک کی تعلیم سائنس یعنی بائیلوجی، کیمسٹری، فزکس یا ایگریکلچر سے ہونے ضروری ہے۔ اس کے بعد بی.ٹیک (B.Tech) کورس ہے، کئی یونیورسٹیوں میں بی.ایس.سی (بایوٹیکنالوجی) کورس شروع ہو چکے ہیں۔ سائنس گریجویٹ کے علاوہ انجینئرنگ میڈیکل کے گریجویٹ بھی بایوٹیکنالوجی میں ایم.ایس.سی (M.S.C.) کرسکتے ہیں۔

B.T. میں کورسز کے نام:

M.Sc. (Bio Technology)
M.Sc. (Agriculture B.T.)
M.Sc. Animal B.T.
M.Sc./M.V.Sc. (Veterinary B.T.)
M.Sc. (Marine B.T.)
M.Tech (Biomedical Engineering)

آئی.آئی.ٹی. دہلی اور کھڑگ پور میں IIT/JEE امتحان کے ذریعے M.Tech پروگرام میں داخلہ دیا جاتا ہے جو کہ (10+2) کے طلبہ کے لیے ہوتا ہے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس (AIIMS) دہلی، جودھپور یونیورسٹی، کلکتہ یونیورسٹی بھی بارھویں کے بعد M.Tech کورس کے لیے علاحدہ علاحدہ ٹیسٹ کے ذریعے داخلے دیتی ہیں۔ مہاراشٹر میں پونے یونیورسٹی B.Sc.، M.Sc. کے ساتھ ساتھ ایم.بی.اے. ان بایوٹیکنالوجی (M.B.A Bio-Tech) جیسے کورس شروع ہو چکے ہیں۔ پونے میں ہی ماڈرن کالج، شیواجی ڈیپارٹمنٹ (B.T.) کی معلومات کورسز کی معلومات دینے والا ادارہ ہے۔ پونے یونیورسٹی میں بارھویں کے بعد پانچ سالہ کورس کے علاوہ JNU کے ایڈمیشن ٹیسٹ کے ذریعے بھی داخلے دیے جاتے ہیں۔ آئی.آئی.ٹی. ممبئی میں JEE امتحان کے ذریعے M.Tech کورس وغیرہ خاص ہیں۔ بایوٹیکنالوجی، بایومیڈیکل، بایوانجینئرنگ، صحت اور ایگریکلچر سے منسلک نئی نئی کارآمد شاخیں جو کہ انسانی زندگی کو فائدہ پہنچانے کا کام کر رہی ہیں۔ خطرناک بیماریوں کے علاج کے لیے دوائیاں، فصلوں کو ہونے والے نقصانات سے حفاظت وغیرہ اس میں شامل ہیں۔ ان نئی شاخوں میں بایوانفارمیٹکس (Bio-Informatics) سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ کرناٹک گورنمنٹ نے ICICI ادارہ کی مدد سے بینگلور میں انسٹی ٹیوٹ آف بایوانفارمیٹکس اینڈ بایوٹیکنالوجی کی بنیاد ڈالی ہے۔

B.T. میں نوکریوں کے امکانات بھی دن بہ دن بڑھ رہے ہیں۔ B.T. ٹیچر، ریسرچ سائنسداں، مارکیٹنگ منیجر، سائنس رائٹر بایوانفارمیسٹ، کوالٹی کنٹرول آفیسر، غذا (Foods) پروڈکشن، کیمیکل انڈسٹری دوائی (Pharma) انڈسٹری، ماحولیات وغیرہ کے علاوہ B.T. کے گریجویٹ تعلیم یافتہ لوگوں کو گورنمنٹ سیکٹر میں یونیورسٹی اور کالجوں میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں کئی مواقع دستیاب ہیں۔ ہندوستان لیور لمیٹڈ تھاپر گروپ، انڈو امریکن ہائبریڈ (Hybrid) سیڈس، بنکان (Bincon) انڈیا لمیٹڈ، انڈیا ڈیکسن کارپوریشن ہندوستان اینٹی بایوٹیکس، نیشنل باٹینکل (Botanical) لمیٹڈ، نیشنل کیمیکل لیباریٹریز ٹاٹا انجینئرنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ وغیرہ نامور کمپنیاں اپنے یہاں B.T. کے ماہرین کی بڑی تعداد کی مانگ رکھتی ہیں۔

جس طرح آج انفارمیشن ٹیکنالوجی (I.T.) کے ماہرین پوری دنیا میں اپنی بہترین کارکردگی انجام دے رہے ہیں اسی طرح ماہرین امید ظاہر کر رہے ہیں کہ B.T. کے ماہرین بھی مستقبل میں اپنی قابلیت کا لوہا پوری دنیا میں منوائیں گے۔

□□□

پتہ:
Lecturere and Career Councellor,
Shah Babu College, Pator, Dist. Akola-444501
(M.S.)

شجاع الدین شاہد

ظفر گورکھپوری سے گفتگو

ظفر گورکھپوری عصر حاضر کے ممتاز قلمکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کا شعری سفر گذشتہ نصف صدی سے آج تک تازہ روی کے ساتھ جاری ہے۔ آپ کی اہم تصانیف ہیں ''تیشہ'' (1962)، ''وادیِ سنگ'' (1975)، ''گوکھرو کے پھول'' (1986)، ''چراغِ چشمِ تر'' (1990)، ''آر پار کا منظر'' (1997)، اردو اور ہندی، ''ناچ میری گڑیا'' (1978)، ''سچائیاں'' (1979) اور ''زمین کے قریب'' (2001)۔ ملک کی مختلف اردو اکادمیوں کے کئی انعامات کے علاوہ آپ کو ''فراق سمان'' (1996) سے بھی نوازا گیا ہے۔ ظفر گورکھپوری سے کی گئی گفتگو کے چند اقتباسات قارئین کی نذر ہیں۔

● ظفر صاحب! آپ عہد حاضر میں اردو کے نمائندہ شعرا میں ہیں، کچھ اپنے خاندانی پس منظر کے تعلق سے بتایئے؟

● میں کسان ہوں۔ کھیتی باڑی کے ساتھ ہتھ کرگھے پر کپڑا بننا اور گاؤں کے بازاروں میں فروخت کرنا میرے اجداد کا پیشہ تھا۔ بچپن میں مکتب سے آنے کے بعد میں بھی کھیتی باڑی کے کاموں میں اپنی والدہ کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ کھیت میں ہل کیسے چلاتے ہیں؟ بیج کیسے بوتے ہیں؟ آب پاشی کیسے کی جاتی ہے؟ فصل کیسے کاٹی جاتی ہے؟ کھلیان کیا ہوتا ہے؟ بچپن کے یہ سارے مشاہدے اور تجربے میری یادوں میں آج بھی محفوظ ہیں۔ والد صاحب پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن تعلیم کی اہمیت کا اندازہ انھیں ہوگیا تھا۔ وہ مجھے بمبئی لے آئے۔ پڑھایا لکھایا، ورنہ آج شاید میں گاؤں میں اپنے کھیتوں میں ہل چلاتا ہوتا۔

● آپ کی شاعری کی ابتدا کب ہوئی؟ پہلی تخلیق کب شائع ہوئی؟

● شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ 14/13 سال کی عمر میں جب میں بمبئی کے انجمن اسلام میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا، تبھی سے تھوڑی تھوڑی طبع آزمائی شروع کردی تھی۔ شاعری کا باقاعدہ آغاز 1950 کے بعد میں ہوا۔ شروع میں کچھ کچی پکی نظمیں بمبئی کے روزناموں میں شائع ہوئیں۔ 1952 میں دہلی سے نکلنے والے ادبی رسالے ''شاہراہ'' میں پہلی بار ایک نظم شائع ہوئی جس کا عنوان تھا ''بہار کے بعد''۔ ''شاہراہ'' ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا۔ اس زمانے میں اس کے مدیر دامق جونپوری یا مخمور جالندھری تھے۔ ''شاہراہ'' جیسے معیاری رسالے میں چھپنا مجھ جیسے نئے شاعر کے لیے کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

● آپ نے شاعری کو ہی کیوں اپنا ذریعۂ اظہار بنایا۔ نثر نگاری پر کیوں توجہ نہیں دی؟

● جی ہاں! نثر پر میری توجہ کم رہی ہے لیکن اتنی کم بھی نہیں۔ میں نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے۔ کتابوں کے دیباچے لکھے، بچوں کے لیے کہانیاں اور ڈرامے (One act Play) لکھے، کچھ فلموں کے مکالمے تحریر کیے اور ایک کتاب جو بارہ اہم ادبی شخصیات کے تذکروں پر مشتمل ہے، تکمیل کے مرحلے میں ہے۔ جہاں تک شاعری کا معاملہ ہے تو یوں کہیے یہ میری محبوبہ ہے۔ اس کی نازکی، نرمی، حیا، شائستگی، اس کا جمالیاتی وصف، اس کی ٹھنڈک، شعلگی، روح کو تازہ اور بالیدہ رکھنے والی اس کی قوت یہ ساری چیزیں میرے مزاج کے عین مطابق ہیں۔ جب کوئی شعر کہہ لیتا ہوں تو یک گونہ سکون محسوس کرتا ہوں اور جب کوئی شعر پسند کا ہوجاتا ہے تو اس کا ذائقہ پورے وجود میں دیر تک محسوس کرتا ہوں۔ شاعری سے میرا لگاؤ فطری ہے۔ اس محبوبہ نے مجھے کڑے سے کڑے وقت میں تھامے رکھا۔ گرنے نہیں دیا۔

● نظم اور غزل کے علاوہ اور کن اصناف سخن کو آپ کے قلم نے چھوا؟

● نظم اور غزل کے علاوہ میں نے گیت اور دوہے لکھے ہیں۔ یہاں یہ عرض کردوں کہ گیت اور دوہے میں نے فیشن کے طور پر نہیں لکھے۔ میرا تعلق ہندوستان کے ہندی بیلٹ سے ہے جہاں گنگا اور جمنا کی زرخیز وادیاں ہیں، ہمالہ کے برف پوش کہستانی سلسلے ہیں، پھر اپنے گاؤں اور اس کی ثقافت سے گہرا تعلق میرے ذہن کو گیت اور دوہوں کی طرف مائل کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں نے اپنے گیتوں اور دوہوں میں ہندوستانی کلچر کا رس بھرنے اور ہندوستان کی مٹی کی سوندھی خوشبو کو الفاظ کے پر عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔

● بچوں کے ادب میں بھی آپ نے خاصا کام کیا ہے۔ بڑے اور نامور ادیب بچوں کے لیے نہیں لکھتے، یا پھر کم لکھتے ہیں، ایسا کیوں ہے؟

● آج کے بڑے ادیب بچوں کے لیے لکھنا کمتر درجے کی تخلیقی ورزش سمجھتے ہیں۔ انھیں بچوں کے لیے لکھنے، بچوں کا ادیب کہلانے میں اپنی توہین محسوس ہوتی ہے۔ جبکہ اور زبانوں میں بچوں کے لیے لکھنا باعثِ افتخار سمجھا جاتا ہے۔ انھیں یہ احساس نہیں ہے کہ اگر آج بچوں میں ادبی ذوق شوق پروان نہیں چڑھا تو کل ان کی کون پڑھے گا؟ غالب، اقبال اور میر کو کون سمجھے گا؟

یہاں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کردوں کہ بچوں کے لیے لکھنا بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کے لیے بچوں کی نفسیات، ان کی دلچسپیوں اور ان کے جبلی

تقاضوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ بمبئی کے محکمۂ تعلیم میں تدریس کے پیشے سے وابستہ ہونے کے بعد جب میرا سابقہ بچوں سے پڑا تو مجھے یہ شدت سے محسوس ہوا کہ بچوں کے ادب کے نام پر جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ بہت ہی کم ہے، وہ آج سائنسی معاشرے کے تقاضوں کو بھی پورا نہیں کرتا چنانچہ میں نے بچوں کے لیے ڈھیر ساری کہانیاں، نظمیں اور ڈرامے وغیرہ لکھے۔ کچھ نظمیں حکومت مہاراشٹر کی درسی کتابوں میں شامل کی ہیں۔ بچوں کے ادب پر مشتمل میری دو کتابیں "ناچ ری گڑیا" اور "سچائیاں" چھپ چکی ہیں۔ تیسری کتاب "دادا کی پگڑی میں چاند" عنقریب شائع ہوگی۔

● آپ نے ترقی پسند تحریک کو فعال دیکھا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ رہے ہیں۔ آپ کے خیال میں کیا اس انجمن کی معنویت آج بھی باقی ہے؟

● میں کبھی سکہ بند ترقی پسند نہیں رہا، نہ میں نے کسی خاص سیاسی نظریے سے وابستگی اختیار کی، نہ میں نے ترقی پسندی کو ان معنوں میں دیکھا جن معنوں میں میرے بزرگ دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی شاعری میں انسانیت کے کرب اور اس زمین کی بیقراری کو اپنی روح تک محسوس کیا ہے، میرے نزدیک یہی ترقی پسندی ہے۔ جب تک استحصالی قوتیں، دنیا میں موجود ہیں، جب تک ظالم کی تلوار مظلوم کے سر پر لٹک رہی ہے، جب تک شرفِ انسانی کو خطرات لاحق ہیں جب تک کرۂ ارض پر انسانی آزادی، انصاف اور امن سے محروم ہے، ترقی پسند نظریے کی معنویت برقرار رہے گی حالانکہ ترقی پسندی اپنے خاص سیاسی تناظر میں بطور تحریک ختم ہو چکی ہے۔

● کیا سجاد ظہیر پاکستان نہ جاتے تو ترقی پسند تحریک کی صورت حال مختلف ہوتی؟

● کوئی فرق نہ پڑتا۔ ہر تحریک ایک مخصوص مدت تک فعال رہنے کے بعد ایک نقطۂ انجماد تک پہنچ کر روبہ زوال ہو جاتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کا بھی زوال ہونا تھا۔ سجاد ظہیر نے پاکستان سے واپسی (1955) پر تحریک کو فعال بنانے کی بہت کوشش کی۔ ان کے بعد بھی بعض ادیبوں نے اسے متحرک کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ چونکہ تحریک اپنا رول ادا کر چکی تھی، اس میں دوبارہ جان نہیں ڈالی جا سکی۔

● 1960 میں جدیدیت کے زیر اثر اردو ادب میں ہونے والی تبدیلیوں کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

● ہر پرانی تحریک نئی تحریک کے لیے کرسی خالی کر دیتی ہے۔ یہ تاریخی عمل ہے۔ 1960 کے آس پاس جب جدیدیت کا غلغلہ اٹھا اور اس کے تحت جو کچھ اس وقت لکھا گیا، اس سے مجھے بڑی وحشت ہوئی۔ ابہام، اہمال، پیچیدہ علامات، ژولیدہ بیانی، ایسا لگا جیسے یہ سب کچھ صرف اپنے لیے لکھا جا رہا ہے۔ خود لکھیے، خود پڑھیے، خود سمجھیے۔ جدید شاعری کے یہ اسلوب اور رویے ایک عام ہندوستانی قاری کی سائیکی کے مطابق نہیں تھے۔ ہمارا قاری جو شاعری کے آئینے میں اپنے اور اپنے اطراف کے مسائل کی عکس بندی دیکھنا پسند کرتا تھا اس کے لیے جدید شاعری بے کشش بلکہ بے معنی ثابت ہوئی۔ حالانکہ یہ صورت حال چند برسوں تک ہی رہی، جوں جوں جدید شاعری کا یہ گرد و غبار تہہ نشیں ہوا اور اس کا تعلق فرد اور سماج سے استوار ہوا، جدید شاعری خوشگوار ہوئی، ہمارا قاری بھی یہی چاہتا تھا۔ شاعری ترقی پسند ہو یا جدید بہر حال اسے شاعری ہونا چاہیے۔

● ترقی پسندی اور جدیدیت کے بعد اب مابعد جدیدیت کے چرچے ہیں۔ ایک پاکستانی نقاد رؤف نیازی نے آپ پر اپنے ایک مضمون میں آپ کے یہاں مابعد جدید شعری رویوں کی نشاندہی کی ہے۔ کیا کہیں گے آپ؟

● میرے ناقدوں میں کسی نے مجھے ترقی پسند کہا، کسی نے جدید ترقی پسند قرار دیا، کسی نے جدید کہا، کسی نے حقیقت پسند کہا۔ دراصل جینوین فنکار کسی خاص تحریک، عقیدے یا نظریے کی قید میں نہیں آتا۔ اس کا فن ہر دور کے ساتھ چلتا ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہر دور پرانا ہو یا نیا اس کے تخلیقی عمل کے آئینے میں اپنے خد و خال اور اپنا چہرہ دیکھتا ہے۔ میں اسے اپنی بڑی کامیابی سمجھتا ہوں۔

● شاعری کی موجودہ صورت حال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا نئی نسل کے شعرا عمدہ نگارشات پیش کر رہے ہیں۔ اگر آپ کی نظر میں ان کا تخلیقی سفر اطمینان بخش ہے تو کیا ان میں کوئی اپنے ممتاز پیشروؤں کے معیار اور مقام تک پہنچ سکتا ہے؟

● نئی نسل کے شعرا ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ کہ ان کی اپنی کوئی لیک نہیں ہے، وہ لکھ رہے ہیں لیکن انھیں یہ نہیں معلوم کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں۔ ان کے آس پاس بے شمار موضوعات بکھرے پڑے ہیں لیکن ان کا قلم انھیں نہیں چھوتا۔ اسی سبب ان کا ذہنی افق بھی وسیع تر نہیں۔ دو چار کو چھوڑ کر زیادہ تر شعرا غزل کے کارخانے چلا رہے ہیں۔ ان کارخانوں سے جو کچھ ڈھل کر نکل رہا ہے وہ ناقص ہے۔ تخلیقیت کی چمک سے عاری ہے۔

● اردو میں نئے تنقیدی، نظریات، اور رجحانات کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

● ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے تنقیدی، نظریات باہر سے درآمد کیے ہیں۔ انگریزی سے اخذ و استفادہ کیے بن ہماری کوئی بات آگے نہیں بڑھی۔ اپنی روایت اور اپنے ادبی رویوں سے نمو پذیر ہونے والی تنقید کا ہمارے یہاں فقدان ہے۔ مستعار تنقیدی نظریات سے ہم اپنے ادب اور شعر و فن کی صحیح پرکھ نہیں

کر سکتے۔ ہمارا تخلیقی مزاج جداگانہ ہے، ہماری روایات الگ ہیں، ہمیں اپنے ادب ہی سے تنقیدی پیمانے اخذ کرنے ہوں گے اور انھی کی روشنی میں اپنے ادب پاروں کو جانچنا اور پرکھنا ہوگا۔

● کہا جارہا ہے کہ فی زمانہ ہمارے تخلیقی ادب پر تنقید حکومت کر رہی ہے، اگر سچ ہے تو اس کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں؟

● جب تخلیقی ادب کمزور ہوتا ہے اور تخلیق کو تن آسانی راس آنے لگتی ہے تو ایسی صورت حال پیدا ہوتی ہے، تنقید تخلیق کے پیچھے چلنے والی چیز ہے۔ اب تنقید تخلیق کے آگے چل رہی ہے۔ جب کوئی تخلیق کار، کسی درجے کا سہی، تنقید کو اپنا حاکم ماننے لگتا ہے اور اس کی جاری کردہ ہدایات پر اپنے تخلیقی رویے وضع کرنے لگتا ہے تو یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہمارا تخلیقی ادب، تخلیق کار کی تن آسانی کے نتیجے میں کمزور رہا تو اس پر تنقید حاوی ہو جائے گی اور یہ ادب کے لیے براشگون ہوگا۔ ہمارے تخلیق کار کو اس صورت حال کا نوٹس لینا چاہیے۔

● آپ ممبئی میں رہ رہے ہیں، فلم سے بھی آپ کا کچھ نہ کچھ تعلق رہا ہے، دیکھا گیا ہے کہ جو شعرا فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے وہ وہیں کے ہو گئے، آپ نے اس عمل سے خود کو کیسے بچالیا؟

● مجھے فلم اور نغمہ نگاری سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ نہ نغمہ نگاری کو ذریعۂ معاش بنانے کی بات کبھی سوچی۔ ہاں کبھی کبھار دوستوں کے اصرار پر کہ فلم ایک بڑا میڈیم ہے اسے نظر انداز کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ وقت نکال کر فلمی دنیا کی چہل قدمی کی، وہ بھی کب؟ جب مجھے کسی پروڈیوسر یا موسیقار نے خود مدعو کیا۔ 25/20 گیتوں سے زیادہ نہیں لکھا۔ میرے لکھے ہوئے اکثر گیت ہٹ ہوئے۔ میرا ذریعۂ معاش درس و تدریس تھا اور میں اس سے پوری طرح مطمئن تھا، شاعری میرا شوق ہی نہیں میرا مشن بھی تھی۔ میں اپنا مشن چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا، مجھے ادبی اور تعلیمی کاموں میں ہی سکون تھا۔ یوں بھی فلم اس دنیا کا گلیمر اس کی چکا چوند اور کاروباری کلچر میرے مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا۔

● فی زمانہ اردو کی عالمی صورت حال اور ملکی تناظر میں آپ اس کے مستقبل سے کتنے پر امید اور کتنے نا امید ہیں؟

● عالمی صورت حال تو یہ ہے کہ امریکا، برطانیہ اور اکثر مغربی دنیا میں اردو کی نئی بستیاں قائم ہیں، آئے دن کانفرنسیں، سیمینار اور مشاعرے ہو رہے ہیں اور اردو کے اخبارات بھی شائع ہوتے ہیں، کتابیں چھپتی ہیں اور یہ ساری سرگرمیاں ان لوگوں کے دم قدم سے ہیں جو معاش کی تلاش میں برصغیر سے ہجرت کر کے دیار غیر میں جا بسے ہیں۔ انھیں روٹی میسر ہے، معاش کے ذرائع بھی وافر ہیں، وہ اردو کے فروغ کے لیے دل کھول کر خرچ کرتے ہیں، انھوں نے اردو تہذیب و ثقافت کو اپنے سینے سے لگا رکھا ہے لیکن مسئلہ ان کے بعد کا ہے۔ ان کی نئی نسل اردو سے نابلد ہے، ان کے بعد اردو کی وراثت کون سنبھالے گا؟ اس کرب کا اظہار خود ایک اردو داں نے مجھ سے کیا۔ جب 1997 میں عالمی مشاعروں کے سلسلے میں امریکا کے دورے پر تھا۔ ادھر ہندوستان میں یہ صورت حال ہے کہ اردو کا دائرہ مسلمانوں تک سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اردو کے ہندو ادیب اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتے۔ متوسط اور نچلے متوسط طبقے کے خوش حال مسلمان اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم کے اسکولوں میں داخل کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اردو اب صرف جھونپڑ پٹیوں میں رہنے والے غریب مسلمان بچے ہی پڑھتے ہیں۔ کم سے کم ممبئی میں تو یہی دیکھا جا رہا ہے۔ سرکاروں کی قائم کردہ اردو اکادمیاں مشاعرے سیمینار کرنے اور کچی پکی کتابوں پر انعامات تقسیم کرنے کے سوا اور کیا کرتی ہیں؟ اصل مسئلہ اردو تعلیم کا ہے۔ کچھ آوازیں ایسی بھی آتی ہیں کہ جب تک اردو کو روٹی روزی سے نہیں جوڑا جائے گا اس کی ترقی ممکن نہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اردو ہماری تہذیبی ضرورت بھی ہے، ہمارے تہذیبی تشخص کے لیے اردو کی تعلیم ضروری ہے۔ گوپی چند نارنگ جب اپنی تقریروں میں یہ کہتے ہیں کہ اردو ہندوستانی زبانوں کا تاج محل ہے تو ہم خوش ہو کر تالیاں ضرور بجائیں لیکن صرف تالیاں بجانے سے کام نہیں چلے گا ہمیں اپنے بچوں کو لازمی طور پر اردو پڑھانا ہوگا اور ساتھ ہی اردو کے جائز حق کے لیے سرکار سے بھی لڑتے رہنا پڑے گا۔ میں اردو کے مستقبل سے ناامید نہیں ہوں لیکن فکر مند ضرور ہوں۔

● آپ کی کتنی کتابیں آچکی ہیں اور کتنی آنے والی ہیں؟

● گذشتہ پچاس برسوں میں میری آٹھ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ جن میں دو کتابیں بچوں کے لیے نظموں اور کہانیوں پر مشتمل ہیں۔ تین کتابیں ''ہلکی ٹھنڈی تازہ ہوا'' (شعری مجموعہ)، ''میرا عہد عشق پرور'' (شخصیات کے تذکرے)، ''مٹی کو ہنسانا ہے'' (گیت اور دوہے) اور ''دادا کی پگڑی میں چاند'' (بچوں کا ادب) بالترتیب اشاعت کے مراحل میں ہیں۔

● ایک آخری سوال، آپ نے نصف صدی میں جو کچھ لکھا اس سے مطمئن ہیں؟

● بالکل نہیں، ایک دوہا سنیے:

پڑھنے کو سات آسماں، لکھنے کو پاتال
لے دے کر کل زندگی چونسٹھ ستر سال

فنکار کا اطمینان صرف موت ہے......بس۔

□□□

پتہ:
75/599 - Housing Board Colony, Gate No-8,
Maloni Malad (West) Mumbai-400095

مُلّا عبدالقادر بدایونی

(ہماری مطبوعات سے)

اکبر کی حکومت کا چوبیسواں سال

پہلی محرم 986ھ/1578 کو نوروز ہوا اور جلوس اکبری کا چوبیسواں سال شروع ہوگیا۔

اکبر پر ایک خاص کیفیت کا ظہور: بادشاہ نے پٹن میں حضرت گنج شکر کے مزار پر حاضری دی اور نندنہ کے نواح میں قمرغہ کے شکار کا ارادہ کیا۔ چار دن تک برابر جانوروں کو ہانکا گیا، جس وقت دونوں طرف سے ہانکنے کے جانور شکارگاہ میں آکر جمع ہوگئے اور بادشاہ شکار کے لیے چلے تو اچانک بادشاہ پر ایک عجیب غیر معمولی حالت طاری ہوگئی اور ان کی ظاہری حالت کچھ اس طرح متغیر ہوگئی کہ اس کی تعبیر کسی طرح ممکن نہیں لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ اسی وقت بادشاہ نے شکار بند کردینے کا حکم دے دیا:

ہشدار کہ فیضِ حق بناگاہ رسد
ناگاہ رسد بر دلِ آگاہ رسد

بادشاہ نے اس درخت کے نیچے جہاں یہ کیفیت وارد ہوئی تھی فقیروں اور مسکینوں کو دل کھول کر خیرات دی اور وہاں ایک عمدہ عمارت اور وسیع باغ کی بنیاد رکھنے کا حکم دیا۔ سر کے بال ترشوائے، بہت سے مصاحبین اس کیفیت و حالت کی بڑھ چڑھ کر تعریف و تائید کرنے لگے۔ جب یہ خبر مشرقی ہندوستان میں پھیلی تو لوگوں میں طرح طرح کی افواہیں پھیل گئیں اور رعایا میں بڑی ہلچل سی پیدا ہوگئی لیکن کچھ عرصے بعد حالات اعتدال پر آگئے۔

مدد معاش کا نیا قانون: بہرہ کی اقامت میں دارالخلافہ سے بیگم بادشاہ لشکر میں تشریف لائیں۔ بادشاہ نے پنجاب کی حکومت سعید خاں مغول کو تفویض کی۔ میر قاضی حسین میبدی کے پوتے علی بغدادی کو پنجاب کے اماموں کی مدد معاش سے متعلقہ آراضیات کے عمل دخل اور اس سلسلے کے دوسرے کاموں پر مقرر کیا گیا، نیز (حکم ہوا کہ) قدیم محالات کو منسوخ کرکے باقاعدہ پیمائش کی جائے اور تمام اماموں کو ایک ہی گاؤں کی آراضیات میں حصہ دار بنا دیا جائے۔ اس نئے انتظام سے تمام ممالک محروسہ کے اماموں میں بڑی بے چینی پھیل گئی۔ یہ سب شیخ عبدالنبی کی ضد سے ہوا اور اس میں اس کے کارندوں کی بددیانتی کا بھی بڑا دخل ہے۔

بادشاہ کی فتح پور کو واپسی: یہاں سے بادشاہ نے فتح پور کو واپسی کے لیے کوچ کیا اور 3 جمادی الثانی کو خضر آباد سادھورہ کے قریب بادشاہ کشتی پر سوار ہوگئے۔ امرا اور عہدے دار بھی ان کے ساتھ کشتیوں پر ہی روانہ ہوئے۔ لشکر نے خشکی کے راستے کوچ کیا۔ اسی مہینے کی 29 تاریخ کو سواری شاہانہ دہلی میں داخل ہوئی اور یکم ماہ رجب کو کشتی سے اتر کر بادشاہ اونٹ پر سوار ہوئے۔ اسی مہینے کی چھ تاریخ کو اجمیر پہنچ کر عرس میں شرکت فرمائی اور دوسرے ہی دن دارالخلافہ کے لیے رخصت ہوگئے۔ اس تیزی سے سفر کیا کہ روزانہ پچاس کوس کا دھاوا مارتے ہوئے نویں رجب کو بروز جمعہ صبح کے وقت تودہ کی منزل پر آکر قیام فرمایا۔ میں بساور سے لوٹ کر بادشاہ کے استقبال کے لیے اسی منزل میں حاضر ہوا اور ایک کتاب ''چہل حدیث'' جس میں جہاد کی فضیلت اور تیر اندازی کے ثواب پر حدیثیں ہیں اور اس کا نام تاریخی ہے، خدمت عالی میں پیش کی۔ بادشاہ نے یہ کتاب کتب خانے میں داخل کرادی اور میری وعدہ خلافی کا کوئی تذکرہ نہ کیا۔ اسی دن شام کو بادشاہ فتح پور پہنچ گئے۔

عبادت خانے میں علما کے ہنگامے: فتح پور آنے کے بعد بادشاہ کے اکثر اوقات عبادت خانے میں علما کی محفل میں گزرتے تھے، خاص طور سے جمعہ کی راتیں شب بیداری میں گزرتی تھیں اور دینی مسائل کی تحقیق اور اصول و فروع کی بحثیں گرم رہتی تھیں۔ ان مجلسوں میں علما کی زبانیں ایک دوسرے کے مقابلے میں تلواروں کی طرح خوب اپنے جوہر دکھاتی تھیں۔ مذہب و مسلک کے اختلافات اتنے شدید ہوگئے کہ ایک دوسرے کی تکفیر دھڑلے سے کی جانے لگی سُنّی، شیعہ، حنفی، شافعی، فقیہہ و حکیم کے موازنے و مقابلے سے گزر کر اصول و مہمات دین پر بھی زبانوں کی چھریاں بے باکی سے چلنے لگیں۔

انھی دنوں مخدوم الملک نے شیخ عبدالنبی کی مخالفت میں ایک رسالہ لکھ دیا تھا جس میں خضر خاں شروانی کو جس پر حضور اکرمؐ کے خلاف بدزبانی کا الزام لگایا گیا تھا اور میر حبش رفض کا الزام تھا، کہا گیا تھا کہ اس کے پیچھے نماز نہیں ہو سکتی، کیونکہ اسے اس کے باپ نے عاق کردیا تھا اور وہ خود خونی بواسیر کے عارضے میں مبتلا ہے۔ شیخ عبدالنبی نے بھی اس کی مخالفت میں بڑی سرگرمی

"منتخب التواریخ" (جلد دوم و سوم) سے ماخوذ، مؤلف: مُلّا عبدالقادر بدایونی / صفحات 620 ، قیمت : -/555روپئے (سیٹ 890روپئے)

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

دکھائی۔ درباری ملاؤں میں سے کچھ اس طرف اور کچھ اُس طرف ہوگئے اور ایک دوسرے کو گمراہ اور خبطی بتانے لگے۔ علما کے ان اختلافات اور جھگڑوں کی وجہ سے اہل بدعت کو خوب کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ انھوں نے حقائق کو مسخ کر کے بادشاہ کو، جو خلوص کے ساتھ طالب حق تھا، لیکن ان پڑھ ہونے کی وجہ سے حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر تھا اور علما کے ان مباحث کی وجہ سے عالم حیرت میں مبتلا تھا، اصل دین ہی سے پھیر دیا اور دین وشریعت کی بنیادوں پر ایسی ضرب لگائی کہ ساری بساط الٹ کر رہ گئی۔

اکبر کی بے دینی کا آغاز: علما کے باہمی اختلافات اور ملحدوں کی مداخلت کی وجہ سے بادشاہ کی نظر میں اسلام اور علمائے اسلام کی وقعت گھٹتی چلی گئی۔ کچھ تو اکبر کی طبیعت اور کچھ حالات کا تقاضا، بہرحال نتیجہ یہی نکلا کہ بادشاہ نے بہت جلد سارے مسلمہ اعتقادات سے منکر ہوکر الحاد و بے دینی کی راہ اختیار کرلی۔ بچپن سے عہد جوانی اور جوانی سے اس پختہ عمری تک اکبر کی کچھ ایسی ہی ڈانواڈول روش تھی۔ وہ کبھی ایک نظریے اور اعتقاد کا پابند نہیں رہا۔ طبیعت میں تحقیق وتجسس کا جذبہ تھا جسے بدعقیدہ مصاحبوں نے غلط رخ پر پھیر دیا۔ ابتدا میں صرف طلب حق کا سچا جذبہ تھا، چنانچہ اسی جذبے کے تحت اکبر ہر دین اور مذہب کے معتقدات اور ان کی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس موقعے پر علمانے بجائے اس کے کہ وہ بادشاہ کو صراط مستقیم پر لے جانے کے لیے حق پسندی کا رویہ اختیار کرتے، اپنے اعزاز و مرتبے کو بڑھانے کی خاطر ایک دوسرے کی تکفیر وتذلیل کرنے لگے۔ ایک ہی چیز کو جب علما کا ایک گروہ حرام اور دوسرا حلال کہنے لگا تو بادشاہ نہایت حیران ہوا اور اُن کی بحثوں سے دل برداشتہ ہوگیا۔ دربار میں مختلف مذاہب ومسالک کے جو لوگ جمع ہوگئے تھے انھوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا اور دین کے معتقدات کو خلاف عقل ثابت کرکے بادشاہ کے ذہن کو انکار وانحراف کی طرف مائل کردیا۔ یہ سب کس طرح ظہور میں آیا اس کی بڑی تفصیلات ہیں۔

وحدت ادیان کا تصور: مجموعی طور پر ایک خیال اس کے ذہن پر پتھر کی لکیر بن گیا تھا کہ اصحاب علم ودانش تمام مذاہب میں موجود ہیں اور کسی قوم وملت میں عبادت گزار صاحبانِ کشف وکرامت کی کمی نہیں رہی ہے اس لیے حق ہر مذہب اور قوم میں یکساں طور پر موجود ہے۔ (اس صورت میں) اس لیے حق کو ایک ایسے دین اور ایک ایسی ملت میں محدود ومنحصر کردینا ضروری نہیں ہے جو نسبتاً نیا اور نو پیدا ہو اور اس کے نزول پر ابھی ایک ہزار سال بھی نہیں گزر رہے ہیں۔ ایک دین کا انکار اور دوسرے کا اقرار اور بغیر کسی سبب کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا کسی طرح بھی معقول ومناسب نہیں ہوسکتا۔

بادشاہ کے اس خیال کو وہ ملحد اور برہمن حسب موقع پختہ اور اٹل بنانے کی کوشش کرتے رہتے تھے جو ان دنوں شاہی محفلوں اور خلوتوں میں پیش پیش نظر آتے تھے اور بہ لحاظ علم ودانش علوم رسمی اور انسانی احوال ونفسیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ بڑی خوبی اور مہارت کے ساتھ اپنے مذاہب اور نظریات پر عقلی اور نقلی استدلال کرکے دوسروں کی تکذیب کرتے رہتے تھے۔ ان لوگوں نے بادشاہ کی خام خیالیوں کو راسخ اعتقادات کی شکل دے دی اور نظریات کو اس طرح بدیہیات بنا کر پیش کیا کہ ان سے پھر جانا اکبر کے لیے ممکن نہ رہا۔

اس نقطۂ نظر کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ حشر ونشر اور دوسرے دینی اصول و معتقدات جن کا ماخذ حکمت نبوی ہے، معتبر اور قابل قبول نہ رہیں۔ دینی مباحث اور نظریات کے متعلق متکلمین میں شدید اختلافات ہیں۔ علم کلام کی کتابوں میں ان کے معارضے اور مجادلے درج ہیں۔ حریفوں نے چن چن کر ان کو ایک خاص زاویے سے بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور اپنے اپنے مسلک و مذہب کی طرف اسے کھینچ لے جانے کی کوشش کی۔

عقیدۂ تناسخ کا اقرار: سب سے پہلے اکبر نے پرکھوتم نامی برہمن کو جو ''نامہ خرد افزا'' کی ترجمانی پر مقرر تھا، تنہائی میں بلا کر موجودات اور اشیا کے ہندی اسما معلوم کیے۔ اس کے بعد دیوی برہمن خلوت شاہی میں حاضر ہوا۔ دیوی برہمن سے مذاکرات کے لیے ایک خاص انتظام کیا گیا تھا۔ ایک چارپائی کو رسیوں سے اوپر کھینچ کر بادشاہ کی خواب گاہ کے جھروکے کے برابر لگا دیا جاتا تھا اور وہ راتوں میں اس معلق حالت میں بیٹھا ہوا اپنی دیومالا کے قصے سنایا کرتا تھا۔ دیوی برہمن ان مترجمین میں ملازم تھا جو ''مہابھارت'' پر کام کررہے تھے۔ ان نشستوں میں اس نے بادشاہ کو ہندو مذہب کے بت پرستی کے اسرار، آگ اور آفتاب کی پوجا اور ستاروں کی تعظیم کے رموز بتائے اور خیالی دیوتاؤں جیسے برہما، مہادیو، بشن، کشن، رام اور مہامائی (جن میں سے بعض کو ہندو خدا اور بعض کو فرشتہ کہتے ہیں) کی عظمت واحترام پر دلیلیں پیش کیں۔ اس کے اپدیش بادشاہ کے دل پر اثر کر گئے اور وہ عقیدۂ تناسخ تناسخ کا قائل ہوگیا۔ خوشامدی درباری کہاں پیچھے رہتے وہ بھی تناسخ کے اثبات وصحت پر رسائل لکھ لکھ کر بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی دوڑ میں لگ گئے۔ بادشاہ ہندوؤں کے مذاہب کی تحقیق کی طرف جن کے ہندوستان میں بے شمار فرقے ہیں اور ہر ایک فرقہ بے شمار کتابوں پر عقیدہ رکھتا ہے بہت زیادہ مائل ہوگیا۔ ہندو مذہب کی طرف میلان کے جو نتائج تھے وہ روز بروز منظر عام پر آنے لگے۔

وحدت الوجود کا اثر: انھی دنوں شیخ تاج الدین ولد شیخ زکریا اجودھنی دہلوی بھی، جن کو اکثر صوفیا ''تاج العارفین'' کہتے ہیں، خلوت گاہ میں باریاب ہوئے۔ وہ شیخ زمان پانی پتی کے شاگرد تھے جو بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جن میں ''شرح لوائح'' کافی مشہور ہے۔ کتاب ''نزہتہ الارواح'' پر بھی

انھوں نے ایک مبسوط شرح لکھی ہے۔ علم تصوف اور علم توحید میں وہ ثانی شیخ ابن عربی سمجھے جاتے تھے۔ تاج الدین بھی راتوں میں معلق چار پائی پر اوپر جا کر رات رات بھر اہل تصوف کے شطحیات اور مزعومات سنایا کرتا، وہ چونکہ شرعی پابندیوں کا قائل نہیں تھا اور گمراہ صوفیوں کی طرح وحدت الوجود کا پکا معتقد تھا جس کا نتیجہ سوائے الحاد اور اباحت کے کچھ اور نہیں نکلتا۔ اس نے وحدت الوجود کے اس خطرناک نظریے اور ''فصوص الحکم'' کے دوسرے مسائل مثلاً ''ترجیح رجا برخوف'' اور ''ایمان فرعون'' وغیرہ بخوبی بادشاہ کے ذہن نشین کرا دیے۔ تصوف کے ان نظریات کا بھی اکبر کے ذہنی فتور اور احکام شریعت سے اس کی بیزاری میں بہت بڑا دخل ہے، چنانچہ اس کا یہ عقیدہ ہوگیا تھا کہ کافر دوزخ کی آگ میں ڈالے تو ضرور جائیں گے لیکن یہ عذاب ان کے لیے دائمی نہیں بلکہ عارضی ہوگا۔ شیخ تاج الدین نے اس مسئلے کو آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے خوب تاویلیں کر کے بخوبی باور کرا دیا تھا اور جب اس نے بادشاہ کو تصوف کی ان بھول بھلیوں میں اچھی طرح سرگشتہ کرا دیا تو اس نے اپنی تعلیم و تلقین کا آخری اور اہم نکتہ جو سب سے زیادہ خطرناک تھا نکال کر سامنے رکھا۔

انسان کامل کا باطل تصور: شیخ نے اکبر کے سامنے ''انسان کامل'' کا ایک تصور پیش کیا اور پھر اس انسان کامل کو خلیفۂ وقت سے تعبیر کر کے خود اکبر کو اس کا مصداق قرار دے دیا۔ شیخ کی کمند انسان کامل سے گزر کر عین واجب تک جا پہنچی۔ حوالی موالی ناچتے کو نچانے والے تھے۔ انھوں نے باتوں کے طوطا مینا بنائے اور خوب شگوفے چھوڑے۔ پھر کیا تھا طرح طرح کی خرافات اور اختراعات شروع ہوگئیں چنانچہ بادشاہ کے لیے سجدہ تجویز کیا گیا اور اس کا نام ''زمین بوس'' رکھا گیا۔ بادشاہ کے ادب و احترام کو اتنا بڑھایا کہ اسے فرض عین اور چہرۂ شاہی کو ''کعبۂ مرادات'' اور ''قبلۂ حاجات'' قرار دیا گیا۔ اس کے رد میں کسی نے زبان ہلائی بھی تو ہندوستان کے بعض مشائخین کے ساتھ ان کے مریدوں کے عمل کو پیش کر کے اس کا منھ بند کر دیا گیا۔

خیر و شر کی وضاحت: ایک اور بزرگ شیخ یعقوب کشمیری اور ان کے ہمنوا بھی اس تگ و تاز میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ شیخ یعقوب بھی بہت سی کتابوں کے مصنف اور اپنے عہد کے مقتدا اور پیشوا سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے قاضی ہمدانی کی ''تمہیدات'' سے بعض باتیں لے کر ان سے یہ فلسفہ ترتیب دیا کہ محمد ﷺ، اللہ کے اسم ''الہادی'' کا مظہر ہیں اور ابلیس دوسرے اسم ''المضل'' کا مظہر ہے۔ اس لیے دنیا کا یہ سارا جلوہ انھی دو اسما کا جلوہ ہے اور خدا کے یہ دونوں مظہر اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ (مفہوم یہ تھا کہ چونکہ خیر و شر من جانب خدا ہیں اس لیے دونوں میں اصل کے لحاظ سے کوئی فرق اور امتیاز نہیں ہے)

شیعیت کی چھاپ: مذکورہ بالا ''خلوت معلق'' کے بلند پروازوں میں ملا محمد یزدی بھی تھا وہ اپنے اعتقاد کے مطابق خلفائے ثلاثہ کے خلاف طنز و طعن کر کے اور عموم صحابہ، تابعین، تبع تابعین، صلحائے سلف و علمائے خلف سب کو کافر بتاتا اور بادشاہ کی نظر میں اہل سنت والجماعت کا درجہ گھٹانے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ بجز شیعہ کے، سب کو اس نے گمراہ کر کے دکھا دیا اور اکبر کے خیالات پر شیعیت کی بھی اچھی خاصی چھاپ پڑ گئی۔

عقیدۂ تثلیث کا اثبات: اسی زمانے میں دربار میں عیسائیوں کی بھی آمد و رفت ہونے لگی تھی۔ یورپ کے اہل علم کو پادری کہا جاتا ہے اور ان کے مجتہد کامل کو ''پاپا'' کہتے ہیں، جسے مصلحت اور وقت کے لحاظ سے امور دین میں تغیر و تبدل کا اختیار حاصل رہتا ہے اور بادشاہ وقت بھی اس سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ جب عیسائی پادری بھی بادشاہ کی عنایت کی نظر سے نوازے گئے تو انھوں نے انجیل پیش کی اور عقیدۂ تثلیث کے حق ہونے پر مباحثے کرتے رہے۔ اکبر نے جو اپنے زعم حق پرستی میں دنیا بھر کی گمراہیوں کا خریدار بنا ہوا تھا، نصرانیوں کو بھی خالی ہاتھ جانے نہیں دیا۔ ان کی عیسائیت کی تصدیق کی اور عیسوی مذہب کو پھیلانے کی ہمت افزائی کی۔ حسب الحکم شاہزادہ مراد نے عیسائی پادری سے انجیل کے چند سبق پڑھے۔ شیخ ابوالفضل کو انجیل کے ترجمے کے لیے حکم دیا گیا، اس نے ترجمہ شروع کیا تو اس پر بسم اللہ کے بجائے یہ فقرہ لکھا!

''ای نامی وی ژژو کرستو''

شیخ فیضی نے قافیہ پر قافیہ چڑھا اور دوسرا مصرع کہا:

''سبحانک لاسواک یاھو''

ان ملعون عیسائیوں کی جسارت اتنی بڑھ گئی کہ انھوں نے دجال ملعون کے اوصاف اور حضور اکرم ﷺ کے اوصاف میں مشابہت پیدا کرنے تک سے دریغ نہیں کیا۔ (اے اللہ معاف کر، یا اللہ پناہ دے)

آفتاب پرستی کا آغاز: بیربر بھی ایک دس کی گانٹھ تھا، اس نے آفتاب پرستی سے اکبر کی آنکھوں کو اس طرح خیرہ کیا کہ آفتاب ہی مظہر کامل اور سرچشمۂ سعادت ہے۔ اس کی تاثیر سے غلہ پکتا ہے، کھیتیاں لہلہاتی ہیں، پھلوں میں رس اور سبزے میں تراوت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا کی روشنی اور دنیا والوں کی زندگی آفتاب ہی سے وابستہ اور متعلق ہے۔ اس لیے وہی ایک ایسا وجود ہے جس کی عبادت اور تعظیم ہونی چاہیے۔ پرستش کے لیے اس کے طلوع کی طرف رخ کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ غروب کی طرف جو زوال کی نشانی ہے... بادشاہ جب ان باتوں کی طرف مائل نظر آیا تو دربار کے بدبخت حکما اور فضلا بھی چراغ دکھانے لگے کہ آفتاب ''نیر اعظم'' ہے۔ ''عطیہ بخش ہمہ عالم ہے، مربی بادشاہان ہے''۔ غرض آفتاب پرستی کا بھی دربار میں خوب فروغ ہوا اور نوروز جلالی کی تعظیم

بڑے اہتمام سے کی جانے لگی چنانچہ ہر سال اس دن اکبر ایک بڑا جشن منعقد کرتا تھا اور سات سیاروں میں سے ہر سیارے کے رنگ کے مطابق روزانہ ایک رنگ کا لباس زیب تن کرتا تھا۔ برہموں نے تسخیر آفتاب کا ایک عمل بتا دیا تھا وہ اس کا وظیفہ نصف شب کو اور طلوع آفتاب کے وقت پڑھا کرتا تھا۔ اس نے گائے کا ذبیحہ بند کرا دیا۔ اس کے گوبر کو پاک سمجھنے لگا اور گائے کا گوشت کھانا حرام ہو گیا۔ طبیبوں نے بھی گاؤ زبانی کی کہ علم طب کی رو سے گائے کا گوشت طرح طرح کی بیماریوں کا باعث ہے اور ہاضمے کو خراب کرتا ہے۔

آتش کدے کا قیام: دربار میں گجرات کے شہر نوساری سے آتش پرستوں کا بھی ایک گروہ دینی خراج لینے کے لیے پہنچ چکا تھا۔ انھوں نے زردشت کے دین کو حق بنا کر پیش کیا اور آگ کی تعظیم کو سب سے بڑی عبادت بتلایا۔ کیانی بادشاہوں کی راہ و روش کے قصے بیان کر کے اکبر کو اپنے معتقدات کی طرف جھکا لیا۔ چنانچہ اکبر نے حکم دیا کہ سلاطینِ عجم کی طرح جو اپنے آتش کدے کو ہمیشہ دہکتا ہوا رکھتے تھے، ہمارے محل میں بھی شب و روز آگ جلتی رہنی چاہیے۔ کیونکہ آگ بھی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور اس کے انوار کا پرتو ہے۔ اس آتش کدے کا انتظام شیخ ابوالفضل کے سپرد کیا گیا۔

اکبر اپنی جوانی کے زمانے ہی سے ہندوستانی راجاؤں کی لڑکیوں کی صحبت میں ہوم (ہَوَن) کیا کرتا تھا جو ہندوؤں کی آتش پرستی کی ایک پوجا ہے۔

آفتاب اور آگ کی پرستش: حکومت کے پچیسویں سال کے نوروز کے دنوں میں اکبر نے آفتاب اور آگ کے سجدے کا اعلان کیا۔ مصاحبین بھی چراغ جلنے کے وقت قیام کا اہتمام کرنے لگے۔ سنبلہ کی آٹھویں عید کے دن اکبر ہندوؤں کی طرح پیشانی پر قشقہ لگا کر دولت خانے میں آیا اور جواہرات پروئی ہوئی ایک ڈوری برہموں سے اپنے ہاتھ پر تبرک کی خاطر بندھوائی اور امرا نے حسب مدارج مروارید اور جواہرات اس دن نذر گزارے اور اس توہم پرستی کی عملاً و قولاً تائید و حمایت کی۔ بادشاہ نے راکھی بندھوانی بھی شروع کر دی۔ غرض اسلام کے خلاف دوسرے مذاہب والے جو حکم اور رسم بھی بیان کرتے تھے اکبر اس کو نص قاطع سمجھتا تھا اور امت مسلمہ کے تمام احکام خلاف عقل تھے جن کو عرب کے سر پھروں اور رہزنوں نے وضع کیا تھا اور ان احکام کو ماننے والے سارے مسلمان بادشاہ کی نظر میں حقیر و ذلیل ہو گئے تھے۔

بتدریج یہ بے دینی اور بد اعتقادی اس انتہا پر پہنچ گئی کہ احکام شریعت اور اسلام کی تردید و تنسیخ کے لیے کسی دلیل اور تاویل کی بھی ضرورت نہیں رہی، جب جی چاہتا کسی بھی حکم کو اعلانیہ ترک کر دیا جاتا۔

□□□

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔
پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی
ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرہ کی زندگی رسم و رواج، سماجی اور مذہبی تقریبات،
ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415، قیمت: -/216 روپے

”کلیات راجندر سنگھ بیدی“ — جلد دوم

مرتب: وارث علوی

راجندر سنگھ بیدی اردو فکشن کا ایک بڑا نام ہے۔ ان کی تحریروں نے قارئین کے بڑے حلقے کو متاثر کیا ہے۔ ”کلیات راجندر سنگھ بیدی“ کی اس دوسری جلد میں بیدی کے ناولٹ ”ایک چادر میلی سی“ اور ان کے ڈراموں کے دونوں مجموعے ”بے جان چیزیں“ اور ”سات کھیل“ جن میں 11 ڈرامے ہیں، ان کے 29 مضامین جن میں انشائیے، خاکے، خطبے، دوسروں کی کتابوں پر لکھے گئے دیباچے، تبصرے، تاثرات اور تنقیدیں ہیں اس کے علاوہ مختلف ادبی شخصیات کو لکھے گئے 31 خطوط ہیں جو اس کلیات میں شامل ہیں۔ بیدی کے فن پر وارث علوی کا مضمون عمدہ ہے جو ان کے فن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

صفحات — 655، قیمت — 380 روپے

اردو خبر نامہ

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام اردو نصاب پر سہ روزہ ورکشاپ

● نئی دہلی۔ 29 رنومبر، آج ہندوستان کی کم وبیش دو سو یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جا رہی ہے لیکن ان تمام یونیورسٹیوں کا نصاب ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہے اور اس سے طلبہ کو بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اب سے کچھ ماہ قبل قومی اردو کونسل نے اردو نصاب کی تیاری کے لیے ایک دو روزہ ورکشاپ کا انعقاد کیا تھا جس میں ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کے اساتذہ نے شرکت کی تھی اور سرٹیفکیٹ، ڈپلوما، ایڈوانس ڈپلوما، بی.اے. اور ایم.اے. کے نصاب کا خاکہ تیار کیا گیا تھا تاکہ پورے ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں ان تمام سطحوں پر یکساں نصاب رائج ہو اور طلبہ کو غیر ضروری محنت اور الجھن سے چھٹکارا مل سکے۔ اس ورکشاپ میں نصاب کا جو خاکہ تیار کیا گیا تھا اس پر دو ماہ قبل کشمیر میں منعقدہ انجمن اساتذۂ جامعات ہند کی کانفرنس میں بھی بحث کی گئی تھی۔ اس بحث کے بعد جو خاکہ نصاب کا سامنے آیا اس کو حتمی شکل دینے کے لیے قومی اردو کونسل نے اردو اساتذہ کی سہ روزہ اردو نصاب ورکشاپ کا انعقاد اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی کے کنونشن ہال میں کیا۔ اس ورکشاپ کے پہلے دن پروفیسر لطف الرحمٰن کی صدارت میں اساتذہ کی ایک کمیٹی نے سرٹیفکیٹ، ڈپلوما، ایڈوانس ڈپلوما اور بی.اے. (آنرس) کے نصابات کے خاکوں پر غور کیا۔ اس ورکشاپ میں حصہ لینے والوں میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر فضل امام، پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر بیگ احساس، ڈاکٹر شیما رضوی، ڈاکٹر شہناز نبی، ڈاکٹر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر نصیر احمد خاں، ڈاکٹر شاہد پرویز، ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، ڈاکٹر خالد سعید، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈاکٹر ارجمند آرا اور ڈاکٹر اسلم جمشید پوری شامل تھے۔ اسی کے ساتھ ایک کمیٹی نے پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی صدارت میں بی.اے. اور ایم.اے. کے اردو نصاب کے خاکوں پر گفتگو کی۔ اس ورکشاپ میں پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر بیگ احساس اور ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی شامل تھے۔ ان دونوں ورکشاپوں کی بحثوں میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے بھی حصہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ ابھی ہمیں سرٹیفکیٹ، ڈپلوما، ایڈوانس ڈپلوما، بی.اے. اور ایم.اے. کے نصابات کا ایسا خاکہ تیار کرنا ہے جس سے تمام یونیورسٹیوں کے نصاب میں 80 فی صدی یکسانیت لائی جاسکے اور 20 فی صد کی انھیں آزادی ہو کہ وہ اپنے علاقائی ادب کا مطالعہ اس کے تحت کر سکیں۔ ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ یہ نصاب کا ایک خاکہ ہوگا جو قومی اردو کونسل ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کو بھجوائے گی اور ان سے درخواست کرے گی کہ وہ اپنی یونیورسٹیوں میں اسے شامل کریں۔ اسی کے ساتھ ہمارا یہ بھی ارادہ ہے کہ نصاب کی دستیابی کی مشکلات کے حل کے لیے قومی اردو کونسل سرٹیفکیٹ، ڈپلوما، ایڈوانس ڈپلوما، بی.اے. اور ایم.اے. کا مکمل نصاب بھی شائع کرے تاکہ ان یونیورسٹیوں کو اس کی تدریس میں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اردو نصاب ورکشاپ کے دوسرے دن کی کارروائی کا آغاز صبح 10 بجے اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے کنونشن ہال میں ہوا۔ صدارت پروفیسر لطف الرحمٰن نے کی اور شرکا میں قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید، پروفیسر فضل امام، پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر ابوذر عثمانی، ڈاکٹر نصیر احمد خاں، ڈاکٹر شیما رضوی، ڈاکٹر شہناز نبی، ڈاکٹر خالد سعید، ڈاکٹر شاہد پرویز، ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر ارجمند آرا، ڈاکٹر ابوبکر عباد، محترمہ فرحت رضوی اور ڈاکٹر رئیس احمد شامل تھے۔ ورکشاپ میں بی.اے. اور ایم.اے. اردو کے نصابات کا خاکہ پوری طرح مکمل کر لیا گیا جس میں یہ کوشش کی گئی کہ یہ نصاب اردو زبان و ادب کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ اردو کو درپیش مسائل کا بھی احاطہ کر سکے اور اس نصاب کو ایسی شکل دی جا سکے جو طلبہ میں اردو زبان و ادب سے سچی اور گہری دلچسپی پیدا کر سکے اسی کے ساتھ ان کے لیے روزگار کے مواقع بھی فراہم کر سکے۔ چنانچہ اس نصاب میں اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ مختلف عصری اور تکنیکی علوم کی بھی گنجائش رکھی گئی جو طلبہ اختیاری پرچے کے طور پر لے سکیں۔ ہندوستان کی تقریباً تمام اہم یونیورسٹیوں سے تشریف لائے اساتذہ نے دن بھر بی.اے. اور ایم.اے. کے نصابات کی تمام شقوں پر بحث کے بعد اسے حتمی شکل دی اور یہ طے کیا گیا کہ سرٹیفکیٹ، ڈپلوما اور ایڈوانس ڈپلوما کے نصابات کو حتمی شکل کل کی بحث کے بعد دی جائے گی۔ اس کے بعد کونسل اپنی تمام سفارشات تمام یونیورسٹیوں کو بھجوائے گی تاکہ پورے ملک کی یونیورسٹیوں میں یکساں نصاب رائج ہو۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے پھر کہا کہ نصاب کا خاکہ تیار کروانا اور اسے تمام یونیورسٹیوں کو بھجوانا پہلا قدم ہے۔ کونسل اس کے بعد سرٹیفکیٹ، ڈپلوما، ایڈوانس ڈپلوما، بی.اے. اور ایم.اے. کے نصاب تیار کر کے شائع بھی کرے گی تاکہ نصابی مواد کی فراہمی میں دشواری نہ ہو۔

اردو نصاب ورکشاپ کے تیسرے دن کی کارروائی کا آغاز صبح 10 بجے

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے کنونشن ہال میں ہوا۔ صدارت پروفیسر لطف الرحمٰن نے کی، شرکا میں پروفیسر فضل امام، پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر ابوذر عثمانی، ڈاکٹر نصیر احمد خاں، ڈاکٹر شیما رضوی، ڈاکٹر شہناز نبی، ڈاکٹر خالد سعید، ڈاکٹر شاہد پرویز، ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈاکٹر ارجمند آرا، ڈاکٹر ابوبکر عباد، محترمہ فرحت رضوی اور ڈاکٹر رئیس احمد شامل تھے۔ ورکشاپ میں گذشتہ دو دنوں میں تیار کیے گئے مختلف سطحوں کے مختلف نصابات کا موازنہ کیا گیا اور بحث کے بعد سرٹیفکیٹ، ڈپلوما، ایڈوانس ڈپلوما، بی.اے.(آنرس) اور ایم.اے. اردو کے نصاب کا خاکہ تیار کیا گیا اس پر شرکا نے خصوصی زور دیا کہ یہ نصاب نہ صرف یہ کہ اردو زبان و ادب کو پوری طرح محیط ہو بلکہ طلبہ کے مسائل روزگار کو بھی حل کر سکے اور اسی خیال کے پیش نظر بی.اے. اور ایم.اے. میں بھی ووکیشنل کورسیز کے طور پر کچھ نئے ڈسپلینز کو متعارف کرانے پر زور دیا گیا اور اس کے نتیجے میں سرٹیفکیٹ، ڈپلوما، ایڈوانس ڈپلوما، بی.اے.(آنرس) اور ایم.اے. اردو کا ایسا نصاب تیار کیا گیا جو طلبہ کی ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ روزگار کے سلسلے میں بھی ان کی تربیت میں معاون ثابت ہو۔ اس سہ روزہ ورکشاپ میں ان تمام سطحوں کے الگ الگ نصابات کئی کمیٹیوں نے تیار کیے اور ان پر بحث کے بعد ایک جامع ترین نصاب کا خاکہ سامنے آسکا۔ کھانے کے وقفے کے بعد اختتامی اجلاس شروع ہوا۔ اس کی صدارت بھی پروفیسر لطف الرحمٰن نے کی اور انھوں نے زبان و ادب کی تعلیم کے سلسلے میں نصاب کی اہمیت پر اپنی تقریر میں روشنی ڈالی اور کہا کہ ڈاکٹر علی جاوید مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے وقت کی ایک اہم ضرورت کو محسوس کیا اور اس ورکشاپ کا انعقاد کیا۔ تمام یونیورسٹیوں میں اردو کے الگ الگ نصابات سے جو ذہنی پراگندگی طلبہ میں پیدا ہو رہی تھی اب امید کی جاسکتی ہے کہ طلبہ اس سے نجات حاصل کر سکیں گے۔ ڈاکٹر علی جاوید نے اپنی تقریر میں تمام مندوبین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ نصابات کا یہ خاکہ جتنی محنت سے تیار کیا گیا ہے اس کے پیش نظر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ نصاب جامع ترین ہوگا اور طلبہ کی ذہنی تربیت کا فریضہ کما حقہ ادا کر سکے گا۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل جلد سے جلد UGC کو نصابات کا یہ خاکہ سونپ دے گی اور UGC سے درخواست کرے گی کہ ساری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اس کو نافذ کیا جائے۔ اس کے بعد ہم چند اور ورکشاپ کے ذریعے ان خاکوں میں نشان زد کیے گئے مواد کو یکجا کر کے کتابی شکل میں بھی شائع کریں گے تاکہ نصابی مواد کی فراہمی میں طلبہ کو دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر ابوبکر عباد نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور اس طرح یہ سہ روزہ ورکشاپ اختتام پذیر ہوئی۔

پانی پت میں حالی میلہ

● پانی پت۔22 نومبر، نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر حامد انصاری نے کہا کہ خواجہ الطاف حسین حالی کا عہد ایک صبر آزما عہد تھا۔ آزادی غلامی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ نئی سوچ اور نئے طریقۂ کار کی طرح پڑ چکی تھی۔ اس دور کو عوامی فائدے میں کیسے بدلا جائے گا یہ ایک بڑا چیلنج تھا۔ حالی سمیت متعدد دانشور ایک ہی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ماڈرن ایجوکیشن حاصل کی جائے۔ ڈاکٹر حامد انصاری مقامی حالی پارک میں، حالی میلہ کی افتتاحی تقریب کو خطاب کر رہے تھے۔ تقریب میں ریاستی گورنر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی، وزیر اعلیٰ بھوپندر سنگھ ہڈا اور پاکستان کے سابق وزیر خزانہ مبشر حسین سمیت سیکڑوں افراد حصہ لے رہے تھے۔ نائب صدر جمہوریہ نے مزید کہا کہ آج ہم پانی پت کے ایک ایسے فرزند کو یاد کر رہے ہیں، جس کی خدمات کو بعض لوگوں نے بھلا دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ سوا صدی پہلے خواجہ حالی نے لڑکیوں کی تعلیم پر جو فوکس رکھا، وہ آج کے دور میں بھی قابل قدر ہے۔ حالی صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ مصلح بھی تھے۔ نائب صدر جمہوریہ نے خواجہ حالی کے بہت سے اشعار مختلف موضوعات کے حوالے سے پیش کیے۔ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر اے. آر. قدوائی نے کہا کہ پانی پت امن اور علم و ہنر کا حامل شہر ہے۔ یہاں سے تعلیمی ترقی اور اسکالرشپ کے فروغ کے لیے مزید منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ وزیر اعلیٰ بھوپندر سنگھ ہڈا نے کہا کہ پانی پت صوفی سنتوں کا شہر رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ خواجہ الطاف حسین حالی سماجی انقلاب کے حامی تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں ایکتا اور حب الوطنی کا درس دیا ہے۔ حب الوطنی ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وزیر اعلیٰ نے حالی ٹرسٹ کے لیے 5 لاکھ روپے دینے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ حالی کے مکان میں لڑکیوں کا اسکول قائم کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ الطاف حسین حالی نے خواتین کے بلند معیار کی باتیں، اس وقت کہی تھیں، جب کوئی اس سمت میں سوچ نہیں رہا تھا۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اردو زبان قومی اتحاد کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ انھوں نے اپنے پاکستان کے دورے کا تذکرہ کیا اور کہا کہ دونوں ملکوں کی تہذیب یکساں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپسی تعاون کو مزید مضبوط کیا جائے۔ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے پاکستان کے سابق وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر حسین نے کہا کہ ہمارے آباو اجداد اسی شہر کے تھے۔ ہم یہاں سے خود نہیں گئے بلکہ نکالے گئے تھے۔ انھوں نے اس عہد کے پانی پت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت شہر کے معروف گھرانے خواتین کے نام سے جانے جاتے تھے۔ عورتوں کے نام کافی اراضی ہوتی تھی۔ انھوں نے انگریز کے دور سے پہلے کے پانی پت پر بھی مفصل روشنی ڈالی اور بتایا کہ اس شہر میں سماج کو

اوپر اٹھانے میں خواتین کا کیا رول رہا ہے۔ قبل ازیں حالی ٹرسٹ کی چیئر مین ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے کہا کہ خواجہ حالی کے اشعار آج بھی نئے سویرے کے مانند ہیں۔ ان کی زندگی کا سب سے اہم درس، باہمی اخوت تھا۔ وہ ہندو مسلم کو دو آنکھیں قرار دیا کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ حالی کے اشعار سے حاصل روشنی کو مزید عام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر ''داستان حالی'' اور ''حالی کی چنیدہ نظمیں''، نامی کتابوں کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ حالی ٹرسٹ کی طرف سے نائب صدر جمہوریہ سمیت معزز مہمانوں کو حالی کی تصاویر بھی پیش کی گئیں۔ حالی ٹرسٹ کی طرف سے منعقد اس پروگرام کا ایک حیرت انگیز پہلو یہ بھی تھا کہ اسٹیج پر نہ تو اردو زبان میں کوئی بورڈ تھا اور نہ اردو کا کوئی بینر۔ حد یہ کہ معزز مہمانوں میں سے کوئی ایک بھی خواجہ الطاف حسین حالی کے مزار پر فاتحہ خوانی اور گلہائے عقیدت پیش کرنے کے لیے نہیں گیا، جب کہ درگاہ قلندر صاحب میں موجود عملہ نصف یوم تک مہمانوں کی آمد کا منتظر رہا۔ وقف بورڈ کی طرف سے درگاہ بوعلی شاہ قلندر اور خواجہ الطاف حسین حالی اور دیگر مزارات کو دوروز سے سجایا جا رہا تھا۔ ایک دوسرا پہلو یہ رہا کہ اسٹیج پر کوئی بھی مقامی مسلم نمائندہ نہیں تھا۔ حالانکہ شہر میں متعدد مؤقر علما اور اردو زبان کے ادیب موجود ہیں۔ (ہمارا سماج، دہلی)

● پانی پت۔ 23 نومبر، شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی کے 171 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر حالی پارک میں دو روزہ حالی میلے میں ہریانہ ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ''حالی کی وراثت اور خواتین کا ارتقا'' کے موضوع پر سیمینار منعقد کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت مدھیہ پردیش کے سابق وزیر و سابق ممبر پارلیمنٹ عزیز قریشی نے کی۔

سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے شہید بھگت سنگھ کے بھانجے پروفیسر جگموہن سنگھ نے کہا کہ خواتین کے ارتقا کے لیے شہید بھگت سنگھ کے خیالات بھی حالی کے خیالات سے ملتے جلتے تھے، افسوس ہے کہ آج ہم ان عظیم شخصیات کے خیالات و افکار کو بھلاتے جا رہے ہیں۔ مہیلا جن وادی سمیتی کی کارکن محترمہ جلبتی سانگوان نے کہا کہ آج حالی کی وراثت کو تحفظ کی ضرورت ہے۔ کروکشیتر یونیورسٹی میں شعبۂ ہندی کے ریڈر ڈاکٹر سبھاش چند نے کہا کہ حالی کی ''مناجات بیوہ'' خواتین کی عام زندگی کی تصویر پیش کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ حالی خواتین کو زیور تعلیم سے مزین کرنا چاہتے تھے۔

علی گڑھ سے آئی محترمہ زویا زیدی نے کہا کہ انھیں یہ سن کر خوشی ہوتی ہے کہ ہریانہ سرکار لڑکیوں کی تعلیم اور ان کی شادی کے لیے پیکیج دے رہی ہے لیکن ساتھ ہی یہ خبریں سن کر دکھ بھی ہوتا ہے کہ حالی کی ریاست میں اگر لڑکی بغیر بتائے چلی جاتی ہے تو اسے ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ ہریانہ سماج کلیان بورڈ کی چیئر پرسن محترمہ رینو پوسوال نے حالی کا ایک شعر پڑھ کر سنایا۔ اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، قوموں کی عزت تم سے ہے، انھوں نے حالی کی حیات اور خواتین کے تئیں ان کے افکار پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر زاہدہ زیدی نے سرسید اور حالی کے نظریات کو مختلف بتایا۔ انھوں نے سرسید کو سائنٹفک نظریات کا حامی اور حالی کو مذہبی نظریات کے قریب قرار دیا۔ پروگرام کے صدر عزیز قریشی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ حالی کے الفاظ، مسلمانوں کو تعمیر نو کے پیغام دیتے تھے۔ حالی نے وقت کو پہچانتے ہوئے جدید تعلیم کے حصول پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ حالی کی مسدس مرثیہ نہیں ہے بلکہ ایک مردہ قوم کو زندہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ مسدس میں مولانا الطاف حسین حالی نے قوم کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے دعوت فکر دی ہے کہ وہ عمل صالح سے اپنی زندگی سنواریں۔

حالی پانی پتی ٹرسٹ کی چیئر پرسن ڈاکٹر سعیدہ حمید نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کے آخر میں ثقافتی پروگرام پیش کرنے والے بچوں کو انعامات تقسیم کیے گئے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو تنقید کا جدید منظر نامہ

● کشمیر۔ 22 اکتوبر، یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے ایک سہ روزہ قومی سیمینار کا انعقاد 20 سے 22 اکتوبر، 2008 کو یونیورسٹی کے گاندھی بھون میں کیا، جس میں قومی سطح کے اردو ادیبوں اور نقادوں کے علاوہ ریاست جموں وکشمیر کے اردو اساتذہ اور دیگر محبانِ اردو نے شرکت کی۔ سیمینار کا موضوع ''اردو تنقید کا جدید منظر نامہ'' تھا۔

سیمینار کا آغاز پروفیسر نذیر احمد ملک، صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کے خطبۂ استقبالیہ سے ہوا، انھوں نے کہا کہ شعبۂ اردو نے ریاست میں اردو کی ترویج و ترقی کے لیے ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ سیمینار کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر ملک نے اردو کے موجودہ تنقیدی منظرنامے کے حوالے سے چند اہم نکات کو مجملاً بیان کیا، جن میں مابعد جدیدیت کے تحت سامنے آنے والے نظریات جیسے ساختیات، پس ساختیات، ردتشکیل، تانیثیت، قاری اساس تنقید، نو تاریخیت، بین المتونیت، مابعد نو آبادیات، نو مارکسیت، اکتشافی تنقید، امتزاجی تنقید وغیرہ کے بنیادی مقدمات کو زیر بحث لایا گیا۔

افتتاحی جلسے کی صدارت پروفیسر حامدی کاشمیری نے کی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید شریک ہوئے۔ سیمینار کا کلیدی خطبہ پروفیسر شمیم حنفی نے پیش کیا اور کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ریاض پنجابی نے افتتاحی خطبہ پیش کر

کے سیمینار کا باضابطہ آغاز کیا۔ افتتاحی تقریب کے اختتام پر شعبۂ اردو کی پروفیسر محترمہ محبوبہ وانی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ افتتاحی نشست کی نظامت کے فرائض شعبۂ اردو کے پروفیسر جناب مجید مضمر نے انجام دیے۔

سیمینار کی پہلی نشست کا آغاز 21 اکتوبر، 2008 کی صبح گیارہ بجے ہوا۔ اس نشست کی مجلس صدارت میں پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر وہاب اشرفی اور محترمہ ترنم ریاض شامل تھیں۔

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، پروفیسر غلام رسول ملک اور پروفیسر قدوس جاوید نے بالترتیب "موجودہ تقریظ پر اردو تنقید کی گرفت"، "پس جدیدیت: چند غور طلب سوالات" اور "تنقید کا نیا منظر نامہ اور تھیوری" عنوانات کے تحت اپنے مقالے پڑھے۔ اس نشست کی نظامت ڈاکٹر منصور احمد نے کی۔ دوسری نشست کا آغاز دوپہر 2:00 بجے ہوا جس کی صدارت پروفیسر غلام رسول ملک، پروفیسر شمیم حنفی اور جناب فاروق ریزو نے کی۔ اس نشست میں جناب غلام نبی خیال، پروفیسر شافع قدوائی اور پروفیسر صغیر افراہیم نے بالترتیب "تنقید کی توضیح"، "فکشن مطالعات کا عالمی تناظر اور نئی تنقید" اور "معاصر فکشن کی تفہیم۔ آج کی زبان کے حوالے سے" کے عنوانات سے مقالے پڑھے جن پر بحث بھی ہوئی۔ اس نشست کی نظامت ڈاکٹر عارفہ بشریٰ نے کی۔

سیمینار کی تیسری نشست کا آغاز 22 اکتوبر کی صبح 11:00 بجے ہوا۔ صدارت پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر شافع قدوائی اور جناب غلام نبی خیال نے کی۔ پروفیسر وہاب اشرفی، محترمہ ترنم ریاض اور ڈاکٹر سرور الہدیٰ نے بالترتیب "مارکسزم، نیو مارکسزم اور مابعد جدیدیت"، "خواتین اردو ادب میں تانیثی رجحان— مغربی تانیثیت کے حوالے سے" اور "اردو تنقید کی موجودہ صورت حال" کے عنوانات سے مقالے پڑھے۔ جن پر کافی بحث ہوئی۔ نظامت کے فرائض پروفیسر شہاب عنایت ملک نے انجام دیے۔

سیمینار کی چوتھی اور آخری نشست کی صدارت پروفیسر قدوس جاوید اور محترمہ ترنم ریاض نے کی جب کہ پروفیسر بیگ احساس نے ذرا تاخیر سے آکر ایوانِ صدارت میں شرکت کی۔ اس نشست میں تین مقالے ڈاکٹر فرید پربتی، الطاف انجم اور پروفیسر بیگ احساس نے بالترتیب "شبلی کی تنقیدی شخصیت"، "مابعد جدید تنقیدی نظریات اور ادب شناسی" اور "گردشِ رنگِ چمن کا مطالعہ نئی تاریخیت کی روشنی میں" پیش کیے۔ نظامت کے فرائض پروفیسر سبحان کور نے انجام دیے۔

سیمینار کی الوداعی تقریب دن کے 4:00 بجے شروع ہوئی جس کی صدارت پروفیسر ریاض پنجابی نے کی جب کہ پروفیسر حامدی کاشمیری نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ جناب غلام نبی خیال اور ڈاکٹر نذیر آزاد نے سیمینار سے متعلق اپنے تاثرات کو ظاہر کیا۔ اس تقریب کی نظامت پروفیسر شہاب عنایت ملک نے کی۔ شیخ الجامعہ پروفیسر ریاض پنجابی نے اردو تنقید کے حوالے سے کہا کہ ابتدا میں تنقید "تقریظ" سے مختلف نہیں تھی اور آگے چل کر اس نے تعصب کے تحت ذاتیات کو ترجیح دی۔ اس ضمن میں انھوں نے کچھ مثالیں بھی پیش کیں۔ سیمینار میں شریک مقالہ نگاروں کو مبارک باد دیتے ہوئے انھوں نے پروفیسر وہاب اشرفی اور پروفیسر بیگ احساس کے مقالوں کو لائق تحسین قرار دیا۔ اردو فکشن اور اس کی تنقید کے تناظر میں انھوں نے قرۃ العین حیدر کی کچھ کہانیوں سے متعلق نہایت ہی بلیغ اشارے کیے اور عینی آپا کے تذکرے میں آخر میں میر کا یہ شعر پڑھا:

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

سیمینار کی الوداعی تقریب پر شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر نذیر احمد ملک نے شکریہ کی تحریک پیش کی۔ سیمینار کی کامیابی کا سہرا شیخ الجامعہ پروفیسر ریاض پنجابی کے سر رکھتے ہوئے انھوں نے سیمینار کے ساتھ ان کی ذاتی دلچسپیوں کو اجاگر کیا۔ پروفیسر ملک نے ریاست اور بیرون ریاست سے آئے ہوئے شرکائے سیمینار کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے شعبۂ اردو کے تدریسی اور غیر تدریسی عملے کے تعاون کو سیمینار کی کامیابی کا ضامن قرار دیا۔

(رپورٹ: الطاف انجم، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فاصلاتی تعلیم، کشمیر یونیورسٹی)

اردو نظم — نئے سروکار نئی جہتیں

● نئی دہلی۔ 15 نومبر، نظم نگاری کا وسیع دائرہ آج سمٹتا جا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ آج نظم نگاری زوال پذیر ہے لیکن اگر ہم سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس صنف کو زندہ کرنا چاہیں تو ہمارے تعلیمی ادارے اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کیا۔ وہ اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام منعقد دو روزہ کل ہند سیمینار "آزادی کے بعد اردو نظم کی نشو و نما: نئے سروکار، نئی جہتیں" میں بطور مہمان خصوصی افتتاحی تقریر کر رہے تھے۔ اس سیمینار میں ملک کی مختلف دانش گاہوں میں اردو درس و تدریس کے فرائض میں سرگرم اساتذہ اور ادبی شخصیات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ سیمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے مظہر امام نے دور جدید میں نظم نگاری کے زوال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے جہاں علامہ اقبال کی نظم نگاری کے دور کو سنہری دور قرار دیا، وہیں دوسری جانب انھوں نے فیض احمد فیض کی نظم نگاری کی صلاحیتوں کا لوہا بھی مانا۔ انھوں

نے کہا کہ دور جدیدیت میں بھی کیفی اعظمی اور سردار جعفری جیسی ادبی شخصیات کی ادبی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نظم نگاری پر ابھی پوری طرح سے سکوت طاری نہیں ہوا ہے بلکہ نظم نگاری لسانی تبدیلیوں کے باعث رفتہ رفتہ ارتقا کی جانب گامزن ہے۔ انھوں نے اس بات کی تردید کی کہ اختر الایمان کے بعد نظم نگاری کا فن ختم ہو گیا ہے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی، شعبۂ اردو، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے نظم نگاری کی لسانی و ادبی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ متن، استعارہ، موضوع، معنویت، جدیدیت کی آمیزش موجودہ دور کی دین سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جہاں اقبال نے نظم نگاری میں ڈرامائیت پیدا کی ہے وہیں اختر الایمان کی سحر انگیز زبان نے نظموں میں نفسیاتی معنویت کو سمو دیا ہے۔ دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے خیر مقدمی کلمات میں کہا کہ اردو اکادمی اس طرح کے پروگراموں کا انعقاد وقتاً فوقتاً کرتی رہے گی تاکہ اردو ادب کی ترقی کے لیے ہر ممکن اقدامات کو ممکن بنایا جا سکے۔ جناب انیس اعظمی نے سیمینار کی نظامت کے فرائض انجام دیے اور پروفیسر ساجدہ زیدی، پروفیسر قدوس جاوید، ڈاکٹر خالد علوی، خورشید اکرم، پروفیسر منظر عباس نقوی، پروفیسر زاہدہ زیدی اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے نظم نگاری کے مختلف عنوانات پر اپنے مقالات پیش کیے۔

● نئی دہلی۔16 نومبر، ترقی پسند شعریات رومان اور اقدار کو بھی اہمیت دیتی ہے، فن، حسن اور افادیت تینوں کو ساتھ لے کر چلتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جمالیاتی قدر سماجیاتی قدر سے الگ نہیں ہو سکتی، جو بڑی شاعری ہوتی ہے وہ خلوت سے زیادہ جلوت کی شاعری ہوتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر علی احمد فاطمی نے کیا۔ وہ دہلی اردو اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ دو روزہ سیمینار ''آزادی کے بعد اردو نظم کی نشو و نما— نئے سروکار، نئی جہتیں'' کے دوسرے روز تیسرے اجلاس میں اپنا مقالہ بعنوان ''ترقی پسند نظم کی شعریات'' پیش کر رہے تھے۔ مقالے پر ڈاکٹر خالد علوی، پروفیسر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر کوثر مظہری نے سوال اٹھائے۔ قبل ازیں ڈاکٹر کوثر مظہری نے اپنا مقالہ ''عمیق حنفی کی طویل نظم: تجزیاتی مطالعہ'' پیش کیا۔ انھوں نے سند باد شہرزاد، شب گشت، وغیرہ کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی نظموں کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے عمیق حنفی کے یہاں کائنات ان کے اندرون میں سمٹ آئی ہے۔ ان کے یہاں شہر آشوب کی سی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ وہ غیر ضروری علامت و استعارہ سے گریز کرتے ہیں۔ مقالے پر پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر زاہدہ زیدی، پروفیسر قدوس جاوید، ڈاکٹر مولا بخش وغیرہ نے بحث کی اور نظم اور طویل نظم پر سوال اٹھائے۔ پروفیسر قمر رئیس نے سوال اٹھایا کہ طویل نظم پر بات کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اردو میں طویل نظم کا تصور کیا ہے؟ طویل نظم اردو میں کہاں سے آئی ہے؟ پروفیسر زاہدہ زیدی نے علی سردار جعفری کی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کو ڈراما قرار دیا جب کہ قدوس جاوید نے کہا کہ اردو میں مختصر افسانہ، طویل افسانہ، ناول اور ناولٹ، نظم اور طویل نظم کی باتیں ہوتی ہیں لیکن طویل وہی ہے جس میں زندگی پورے طور پر پھیل کر منظر عام پر آئے۔ ڈاکٹر فرید پربتی نے اپنا مقالہ ''وادیٔ کشمیر میں اردو کی نشو و نما'' پیش کیا۔ انھوں نے کمال الدین شیدا، تنہا انصاری، حکیم منظور، حامدی کاشمیری قیصر گلزار، امر چندولی، نند لال کے علاوہ کئی شاعروں کے حوالے سے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے شاعروں نے جہاں مناظر فطرت پر نظمیں لکھی ہیں وہیں کشمیریوں کے ساتھ ہونے والے ظلم و زیادتی کی بھی داستان رقم کی ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید نے اردو نظم کی فکری اساس پر اپنا مقالہ پیش کیا اور کہا کہ جمالیات سے خالی شاعری ہو ہی نہیں سکتی، کوئی شاعر اپنے معاشرے، ثقافت سے باہر نکل کر شاعری کر ہی نہیں سکتا۔ انھوں نے انجمن پنجاب، سر سید احمد خاں تحریک اور ترقی پسند تحریک کے حوالے سے گفتگو کی۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے حیدر آباد کے نمائندہ نظم گو شعرا پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر ساجدہ زیدی اور بلراج کومل نے پیش کیے گئے مقالات پر روشنی ڈالی۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ندیم احمد نے کی۔ دوسرے اجلاس میں پروفیسر زاہدہ زیدی نے منیب الرحمٰن کی نظم نگاری، پروفیسر علیم اللہ حالی نے 1960 کے بعد بہار میں اردو نظم کا فروغ، پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے اقبال کا اثر اردو نظم پر، ڈاکٹر مولا بخش نے آزادی کے بعد اردو میں طویل نظم کی روایت، ڈاکٹر نجم السحر نے جوش کی شاعری میں انسانی عظمت کا تصور، ڈاکٹر راشد انور راشد نے زاہدہ زیدی کی نظم نگاری، پروفیسر منظر عباس نقوی نے جوش کی شاعری میں قدیم اور جدید کی کشمکش اور پروفیسر حنیف کیفی نے اردو میں نظم نگاری کے مغربی ماڈل پر اپنے مقالے پیش کیے۔ صدارت پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر قدوس جاوید اور پروفیسر علی احمد فاطمی نے کی۔ پروفیسر ابن کنول، ڈاکٹر خالد اشرف، اظہار عثمانی، ڈاکٹر اشفاق عارفی، معین شاداب، لئیق رضوی، اطہر علی، احمد کفیل اور سرفراز جاوید کے علاوہ کئی اہم لوگوں نے شرکت کی۔ سیمینار کے آخر میں اردو اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔

(ہمارا سماج، دہلی)

اردو تہذیب کمزور پڑتی ہے تو سانحہ گجرات رونما ہوتا ہے: ڈاکٹر علی جاوید

● نئی دہلی۔26 نومبر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے 5 روزہ عالمی اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے کراچی (پاکستان) روانہ ہوتے ہوئے جو Arts Council of Pakistan کی

طرف سے منعقد کی گئی ہے، کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے ایک ایسی حکمتِ عملی تیار کرنے کی ضرورت ہے جس کے تحت پوری دنیا کے تمام سرکاری اور غیر سرکاری ادارے، جو اردو کے فروغ کے لیے قائم کیے گئے ہیں، ساتھ مل کر کام کرسکیں اور اردو کا کارواں نئی منزلوں کی طرف گامزن ہو۔ اردو صرف ایک زبان نہیں بلکہ ہماری تہذیبی ضرورت بھی ہے اور یہ تہذیب تمام نامساعد حالات کے باوجود پھلتی پھولتی رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب یہ تہذیب کمزور پڑتی ہے تو سانحۂ گجرات رونما ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ فسطائی قوتوں کے نشانے پر اس ملک کی سالمیت کے ساتھ ساتھ اردو بھی ہے اور اگر ہمیں فسطائی قوتوں کو کمزور کرنا ہے تو اردو اور اردو جیسی سیکولر زبانوں کو مضبوط کرنا ہوگا۔ یہ کانفرنس کراچی میں 27، نومبر کو شروع ہوگی اور 1 دسمبر 2008 کو اختتام پذیر ہوگی۔ اس کانفرنس میں اردو کو درپیش مسائل پر گفتگو کی جائے گی اور فروغ اردو کی حکمت عملی بھی وضع کی جائے گی۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر علی جاوید کی شرکت اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین اردو کے جنرل سکریٹری بھی ہیں اور انھوں نے قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی اردو کے فروغ کے لیے کئی اہم اور بڑے کام کیے ہیں جن میں اردو کے مراکز سے دور امپھال اور گوہاٹی میں محبانِ اردو کے عظیم الشان اجتماع کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر علی جاوید کی قیادت میں قومی اردو کونسل نے گوہاٹی میں عظیم الشان اردو کتاب میلہ منعقد کیا تھا جس میں اردو کے تعلق سے گوہاٹی (آسام) کے لوگوں میں جو جوش وخروش دیکھنے میں آیا اس کی مثال اردو کے نام نہاد مراکز میں نہیں ملتی۔ ڈاکٹر علی جاوید نے پاکستان کے لیے روانہ ہونے سے پہلے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ یہ کانفرنس ایک ایسے موقع پر منعقد کی جارہی ہے جب پاکستان میں جمہوریت کا سورج طلوع ہوا ہے، انھوں نے اردو کو جمہوریت پسند زبان بتاتے ہوئے کہا کہ اردو نے ہمیشہ اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ میں حصہ لیا ہے اور یہ ایک ایسی زبان ہے جو مساوات کو زندگی کی بنیادی قدر سمجھتی ہے اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ سیاسی نظام جب بھی اتھل پتھل کا شکار ہوا ہے تو اردو کے شاعروں نے اپنے پیغامِ محبت کو زیادہ شدت اور جوش کے ساتھ دور دور تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اس زبان میں احتجاجی شاعری کی روایت بھی ابتدا سے ہی ملتی ہے اور احتجاج ظاہر ہے کہ کسی نظام کی درستگی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر علی جاوید نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ انھوں نے پہلے بھی کوشش کی تھی کہ پاکستان کے اداروں کے تعاون سے ان کی اہم کتابوں کو ہندوستان میں قومی کونسل شائع کرے اور وہ اب بھی چاہتے ہیں کہ اس زبان کے فروغ کے لیے ہمیں سرحدوں کو پاؤں کی زنجیر نہیں بننے دینا چاہیے۔ کیوں کہ زبانوں کا نہ تو ملک ہوتا ہے اور نہ مذہب۔ بلکہ یہ انسانیت کا مظہر ہوتی ہیں اور اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ کا ذریعہ بھی۔

(ہمارا سماج، دہلی)

اردو اور ہندی ادب کے مطالعے کی نئی سمتیں

● نئی دہلی۔ 2 دسمبر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ ہندی اور قومی اردو کونسل کی مشترکہ کوششوں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نہرو گیسٹ ہاؤس میں آج دو روزہ سیمینار کا افتتاح ہوا جس کا موضوع ''ہندی اور اردو ادب کے مطالعے کی نئی سمتیں'' تھا۔ سیمینار کا افتتاحی اجلاس معروف ہندی ناقد پروفیسر نامور سنگھ کی صدارت میں شروع ہوا۔ سب سے پہلے صدر شعبۂ ہندی پروفیسر عبدل بسم اللہ نے استقبالیہ کلمات میں سیمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ادب کی قرأت کے روایتی پیمانوں کے ساتھ اب اس بات پر غور کرنے کی بے حد ضرورت ہے کہ اس کے لیے کیا نئی سمتیں ہوسکتی ہیں؟ اپنے کلیدی خطبے میں پروفیسر اصغر وجاہت نے سوال اٹھایا کہ اردو ہندی ادب کی قرأت کے نئے معیار قائم کرنے کی اس دور میں کیا ضرورت ہے اور اس کے لیے نئی سمتیں کیوں تلاش کی جائیں؟ افتتاحی خطبہ دیتے ہوئے پروفیسر نامور سنگھ نے کہا کہ ہندی اور اردو الگ الگ زبانیں نہیں ہیں بلکہ یہ ایک زبان ہے اس کا رسم الخط بھلے ہی الگ ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہندی کو جانے بنا اردو کو نہیں سمجھا جاسکتا ہے اور اردو کے بنا ہندی کا کما حقہ عرفان ممکن نہیں، انھوں نے طلبہ پر زور دیا کہ وہ دونوں ہی رسم الخط سیکھیں۔ انھوں نے کہا کہ زبانیں دراصل فعل سے الگ ہوتی ہیں اسم سے نہیں۔ چونکہ ہندی اور اردو میں فعل یکساں رہتا ہے اس لیے یہ دونوں زبانیں ایک ہی ہیں چاہے اس کا فاعل کسی بھی نام کا ہو۔ اس اجلاس کی نظامت پروفیسر درگا پرساد گپت نے کی۔ دوسرے اجلاس کا عنوان ''ہندی اردو ادب کے مطالعے وتدریس کے روایتی ڈھنگوں کی پرتال'' تھا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر مجیب رضوی نے کی اور نظامت ڈاکٹر نیرج کمار نے کی۔ ڈاکٹر سرور الہدیٰ اور ڈاکٹر چندر دیو سنگھ یادو نے موضوع کی مناسبت سے اظہار خیال کیا۔ آخری اجلاس کی صدارت معروف ناقد پروفیسر گنگا پرساد ول نے اور نظامت علیم اللہ نے کی۔ اس اجلاس میں اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ارجمند آرا نے کہا کہ شمس الرحمٰن فاروقی کا تنقیدی نظریہ بعض اوقات جاگیر دارانہ خیالات سے متاثر نظر آتا ہے، جہاں وہ افسانہ اور شاعری میں معیار و مراتب قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج بھی افسانے کی تنقید کا رجحان روایتی ہی ہے۔ معروف ہندی اسکالر جتیندر شریواستو نے کہانی کی تنقید کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ اس میں نیا پن اور نئی راہیں نکالنی چاہئیں۔ انھوں نے کہا کہ تنقید کے معاملے میں کسی ایک نظریے کو ساتھ

لے کر چلنا صحیح نہیں ہے کیوں کہ یہ یک رخاپن کے مترادف ہے۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر گنگا پرساد وِمل نے کہا کہ یہ دیکھنا بے حد اہم ہے کہ جو کچھ طلبہ کو ادب میں پڑھایا جا رہا ہے، کیا وہ اس قابل ہے کہ اسے پڑھایا جائے؟ انھوں نے کہا کہ ہم ساٹھ سال سے زائد عرصے سے پریم چند ہی کو پڑھ رہے ہیں اور ابھی تک اس قابل نہیں ہوئے کہ ان کی کہانیوں کی خامیاں نکال سکیں۔ اس موقعے پر اساتذہ کے ساتھ ساتھ کثیر تعداد میں طلبہ بھی موجود تھے۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

اردو میڈیا — رول اور ذمے داریاں

● نئی دہلی۔ 12 نومبر، معروف صحافی کلدیپ نیر نے آج کہا کہ زبانیں ختم ہو رہی ہیں۔ اردو ہو، ہندی ہو یا پنجابی، سب کا یہی حال ہے۔ زبانوں کو بچانے کے لیے آپ کو پختہ ارادہ کرنا ہوگا۔ آپ خود اردو اخبار خرید کر پڑھیں اور دوستوں کو بھی اس پر آمادہ کریں۔ دیال سنگھ ایونگ کالج میں منعقد ''اردو میڈیا: رول اور ذمے داریاں'' کے موضوع پر مسٹر کلدیپ نیر نے کہا کہ پاکستان میں اردو اخبار ''جنگ'' کی قیمت 14 روپئے ہے۔ وہ سرکولیشن سے اخبار چلاتے ہیں، اشتہار سے نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ملک کا ہر شہری ہندوستانی ہے اور سب کا برابر حق ہے۔ جس دن آپ نے غلط دیکھا اور چپ رہے اسی دن سے آپ مر جاتے ہیں۔ جناب نیر نے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ جنوب ایشیائی یونین بنے کیوں کہ یہاں کی تہذیب ایک جیسی ہے۔ سمپوزیم سے خطاب کرتے ہوئے سینئر صحافی ظفر آغا نے اردو اور انگریزی اخبارات کا موازنہ کراتے ہوئے کہا کہ دونوں کے ڈیزائن تقریباً ایک ہو چکے ہیں اور پہلے صفحے پر اور دیگر صفحات پر جو خبریں شائع ہوتی ہیں وہ بھی تقریباً ایک ہی ہیں۔ اردو میں مسلمانوں سے متعلق کوئی خاص خبر نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ الزام بے بنیاد ہے کہ اردو اخبارات مسلمانوں کو سامنے رکھ کر خبریں شائع کرتے ہیں۔ جناب آغا نے کہا کہ حالیہ دس برسوں میں اردو کو اہمیت دی گئی ہے اور سیاسی پارٹیوں میں اردو میڈیا سیل قائم کیے گئے ہیں۔ ''خبردار جدید'' کے مدیر معصوم مرادآبادی نے کہا کہ زبان کو مذہب کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مذہب کو زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظفر آغا اور معصوم مرادآبادی دونوں نے اپنی تقریروں میں یو۔ این۔ آئی۔ اردو سروس کی کاوشوں کو سراہا اور کہا کہ اس سروس کے شروع ہو جانے کے بعد اردو صحافت کو کافی تقویت ملی ہے۔ پروفیسر محمد شاہد حسین، سنیل دنگ اور ایس۔ اے۔ ایچ۔ رضوی نے بھی اس بات چیت میں حصہ لیا۔ اس موقعے پر ہندی رسم الخط میں شیر سنگھ ناز کی کتاب 'خدنگ ناز' کا اجرا کیا گیا۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

فارسی نے شروع سے ہی اردو شعر و ادب کو متاثر کیا

● مالیر کوٹلہ۔ 24 نومبر، گورنمنٹ کالج مالیر کوٹلہ کی بزم ادب کی جانب سے ایک ادبی تقریب منعقد کی گئی جس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے شعبۂ فارسی کے استاذ پروفیسر ڈاکٹر عراق رضا زیدی مہمان خصوصی کے طور پر تشریف لائے۔ انھوں نے فارسی زبان کے اردو زبان و ادب پر اثرات پر ایک توسیعی خطبہ بھی دیا۔ اس تقریب میں کالج کے ڈگری اور پوسٹ گریجویٹ طلبہ کے علاوہ مالیر کوٹلہ شہر کے محبان اردو نے بھی کثیر تعداد میں شرکت فرمائی۔ کالج کے پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر محمد اقبال نے حاضرین سے ڈاکٹر عراق رضا زیدی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ان کے بزرگوں کا تعلق بھی سرزمین پنجاب ہی سے ہے جو بعد میں یو۔ پی۔ کے شہر بریلی منتقل ہو گئے تھے۔ انھوں نے بریلی، گڑھ اور پٹیالہ میں تعلیم کے اعلیٰ مراحل طے کیے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے کہا کہ توسیعی خطبات طلبہ کے لیے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اگرچہ کوئی خطبہ حرف آخر نہیں ہوتا لیکن اس سے تحقیق و جستجو کے نئے راستوں کی نشان دہی ہوتی ہے۔ کالج کے پرنسپل پروفیسر عبدالسلام نیازی نے ڈاکٹر عراق رضا زیدی اور تقریب کے دیگر مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے کہا کہ شعبۂ اردو نے ملک کے مختلف دانشوروں کو کالج میں مدعو کر کے ایک صحت مند علمی روایت کو استحکام بخشا ہے جس سے ہمارے طلبہ متواتر مستفید ہو رہے ہیں۔ پروفیسر عراق رضا زیدی نے توسیعی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ فارسی کا شمار دنیا کی اہم اور قدیم ترین زبانوں میں ہوتا ہے۔ اس نے ہمیشہ انسانی اخوت اور رواداری کو مضبوط کرنے پر زور دیا ہے۔ ہماری تہذیبی اور ثقافتی زندگی فارسی زبان و ادب کی مرہون منت ہے۔ فارسی کی تراکیب، تشبیہات، تلمیحات اور استعاروں نے اردو زبان و ادب کو وسعت عطا کی ہے۔ صوبۂ پنجاب بھی فارسی کے دو الفاظ پنج اور آب کا مرکب ہے۔ ڈاکٹر عراق رضا زیدی نے مختلف شعرا کے کلام کا حوالہ دیتے ہوئے ثابت کیا کہ فارسی نے شروع ہی سے اردو شعر و ادب کو متاثر کیا ہے۔ اردو کی مختلف اصناف شعری فارسی کے بطن ہی سے وجود میں آئی ہیں۔ تقریب میں مختلف درجات کے اردو طلبہ نے اپنے کلام سے بھی حاضرین کو محظوظ کیا۔ شعبۂ اردو کے استاذ ڈاکٹر محمد رفیع نے تقریب کی نظامت کے فرائض ادا کیے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

اردو ہندی کہانی کی ایک شام

● نئی دہلی۔ 30 نومبر، غالب اکیڈمی نئی دہلی کی جانب سے اردو ہندی کہانی کی ایک شام کا انعقاد گذشتہ شام کیا گیا جس کی صدارت بزرگ افسانہ

نگار جوگندر پال نے کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ کسی اچھی کہانی کا ایک مطلب نہیں ہوتا ہے۔ اچھی کہانی کے لیے کہانی کار کو خود اس میں شامل ہونا ہوتا ہے۔ کہانی کار کو کہانی کا مطلب نہیں بیان کرنا چاہیے۔ جوگندر پال نے کہا کہ فن کار کا کہانی سے غائب ہونا ہی اس کی عظمت ہے۔ اس موقعے پر لاجی سینھ نے ''خالی لفافہ'' مردولا گرگ نے ''تین لمحے''، انجم عثمانی نے ''برزخ'' نگار عظیم نے ''عکس'' غزال ضیغم نے ''بھولے بسرے لوگ'' کے عنوان سے کہانیاں پڑھیں۔ ہندی کہانی پر بولتے ہوئے ڈاکٹر رنجیت ساہا نے کہا کہ ہندی کہانی کے سو سال پورے ہو گئے ہیں۔ ہر سال تقریباً دس ہزار کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ آج کی کہانیوں میں بیانیہ کی زیادتی ہے۔ اردو کہانی کے بارے میں بولتے ہوئے پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے کہا کہ آج کا اردو افسانہ موجودہ دور کی صورت حال سے آنکھیں چار کر رہا ہے۔ دور حاضر کے تمام مسائل اردو کہانیوں میں جذب ہو گئے ہیں۔ اس موقعے پر غالب اکیڈمی کے کمپیوٹر سینٹر کے کامیاب طلبہ میں سند بھی تقسیم کی گئی۔ اس پروگرام میں شریک ہونے والوں میں پروفیسر شمس الحق عثمانی، ڈاکٹر غضنفر علی، پروفیسر صادق، آصف نظر، خورشید اکرام، ذکیہ ظفر، ڈاکٹر خالد، رؤف، رامش، سکندر عاقل، فضل بن اخلاق، ڈاکٹر نجمہ رحمانی اور نسیم عباسی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

(ہمارا سماج، دہلی)

ایک اچھا قاری ہی اچھا تخلیق کار بن سکتا ہے

● علی گڑھ۔ 21 نومبر، گذشتہ روز اے۔ایم۔یو۔ کے شعبہ اردو کے زیر اہتمام ''انجمن اردوئے معلی'' کا ایک پروگرام آرٹس فیکلٹی لاج میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر قاضی جمال نے کی۔ نظامت کے فرائض انجمن کے سکریٹری محمد غالب نشتر نے انجام دیے۔ اردو کے مشہور افسانہ نگار انیس رفیع بحیثیت مہمان خصوصی پروگرام کے دوران موجود رہے۔ شعبۂ اردو کے طلبہ اور اساتذہ کے علاوہ دیگر شعبوں کے طلبہ و طالبات نے بھی پروگرام میں شرکت کی، پروگرام کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ریسرچ اسکالر لئیق احمد نے کیا۔ اس کے بعد شعبے کے کئی طلبہ نے اپنی اپنی تخلیقات پیش کیں۔ ایم۔ اے۔ سال اول کے طالب علم شاہنواز حیدر نے، اختر الایمان کا جدید اردو شاعری میں مقام، کے موضوع پر اپنا مقالہ پڑھا، پی۔جی۔ڈپلوما ان ماس کمیونکیشن کے طالب علم ظہیر الحق ظہیر اشفاق نے اپنی غزل پیش کی۔ پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان ماس کمیونکیشن کے ایک دوسرے طالب محمد حنیف نے اپنا انشائیہ ''موبائل کا فنڈا''، ریسرچ اسکالر آفتاب عالم نے اپنا افسانہ ''پودا'' پیش کیا۔ شعبے کے ریسرچ اسکالر سرفراز خالد نے اپنے متفرق اشعار کے علاوہ ایک غزل پیش کی۔ اس کے بعد مہمان خصوصی نے ''در آید'' کے عنوان سے اپنا ایک افسانہ پڑھا۔ افسانہ شروع کرنے سے قبل موصوف نے اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بہت ہی خوشی ہو رہی ہے کہ آج وہ اس اسٹیج سے اپنا افسانہ پڑھ رہے ہیں جہاں سے اردو کے بڑے اور مایہ ناز ادبا و شعرا پڑھتے رہے ہیں۔ آخر میں صدر جلسہ پروفیسر قاضی جمال نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے پروگرام ذہن سازی کا کام کرتے ہیں اس لیے طلبہ کو چاہیے کہ اس طرح کے پروگرام میں وہ اپنی تخلیقات پیش کرتے رہیں۔ حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کرنے کے دوران انھوں نے یہ بھی کہا کہ جس طرح سے پروگرام کو سنا گیا ہے اور جس طرح سے طلبہ نے اپنے تخلیقی کارنامے پیش کیے ہیں اس کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان آج بھی زندہ ہے اور انشاء اللہ مستقبل میں بھی زندہ رہے گی۔ انھوں نے کہا کہ اچھا قاری ہی بہترین تخلیق کار بن سکتا ہے۔ اس لیے طلبہ کو چاہیے کہ وہ اپنا تخلیقی سلسلہ جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ خوب محنت اور دلجمعی سے کلاسیکی اور ہم عصر ادبا اور شعرا کا مطالعہ کرتے رہیں۔ پروگرام کے دوران صدر شعبۂ اردو پروفیسر خورشید احمد، سرپرست انجمن، ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی، پروفیسر قاضی افضال، پروفیسر محمد طارق چھتاری، ڈاکٹر سراج اجملی، ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب اور ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی وغیرہ کے علاوہ شعبہ کے کئی دیگر اساتذہ بھی موجود تھے۔

(ہمارا سماج، دہلی)

ادب میں کوئی تحریک کبھی مرتی نہیں

● علی گڑھ۔ 22 نومبر، موجودہ عہد کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نئی نسل کے افسانہ نگاروں کو بیان میں، خاص طور پر جنس کی بابت اظہار خیال کرتے ہوئے 'کھلے پن' کا مظاہرہ کرنا چاہیے یا نہیں اور مابعد جدیدیت کے بعد عہد حاضر کو کس نام سے جانا جائے گا؟ متذکرہ بالا سوالوں کے علاوہ دیگر ادبی مسائل پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ریسرچ اسکالروں نے بحث کی۔ یہ مباحثہ اے۔ایم۔یو۔ کیمپس میں واقع شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر سراج اجملی کی قیام گاہ پر منعقد ہوا، جس میں انیس رفیع (کولکاتہ) اور قائد حسین کوثر (کانپور) نے بطور خاص شرکت کی۔ بحث ریسرچ اسکالر آفتاب عالم کے پیش کردہ بلاعنوان افسانے کے بعد شروع ہوئی، جس میں باپ بیٹی کے درمیان جنسی تعلقات اور ان کے کھل جانے پر بیٹی کے عاشق کے پاگل ہو جانے کا بیان ہے۔ افسانہ نگار نے خاصے کھلے پن کا مظاہرہ کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی اور بالکل واضح علامتوں کا استعمال بھی کیا۔ افسانے کا دفاع کرتے ہوئے انیس رفیع نے کہا کہ عہد حاضر کا افسانہ

نگار جو کچھ دیکھ رہا ہے اسے ویسا ہی بیان کرنا چاہتا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ موجودہ عہد کو کسی تحریک یا رویے سے نہیں باندھا جا سکتا اور ادب میں کوئی تحریک یا رویہ کبھی مرتا نہیں بلکہ وقفے وقفے پر اس کی بازیافت ہوتی رہتی ہے۔ سعادت حسن منٹو کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وہ پنجاب کی سوسائٹی کی نمائندگی کرتے تھے جہاں لکھنؤ یا دیگر خطوں سے زیادہ کھلا پن موجود تھا مگر انھیں خونی رشتوں کے درمیان جنسی تعلقات کا خیال نہیں آیا۔ قائد حسین کوثر نے افسانے کی زبان کی تعریف کی اور غیر محتاط بیان سے بچنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ ادب میں ابتذال کی گنجائش نہیں کے برابر ہوتی ہے اور آج کا افسانہ نگار محض چٹخارے دار بیان کو ہی جنسی افسانہ سمجھ لیتا ہے جب کہ حقیقی معنی میں سیکس کا براہ راست تعلق انسانی نفسیات سے ہے۔ جنسی طور پر نا آسودہ شخص نہ صرف اپنے لیے بلکہ پوری سوسائٹی کے لیے ایک بڑا خطرہ ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایجنڈا زدہ ادب اور تخلیقی عمل دو متوازی لکیریں ہیں جن کا ملاپ ادبی منظر نامے کے کسی نقطے پر ممکن العمل نہیں۔ ریسرچ اسکالر لئیق احمد، کمال اختر اور تمکین حسین نے کہا کہ افسانہ نگار کو چھوٹی چھوٹی باتوں کا بیان کرتے ہوئے بھی ٹھیک سے سوچ لینا چاہیے کہ آیا ایسا ممکن ہے یا نہیں۔ خالد سرفراز نے تاثرات اور حقائق کے درمیان توازن کو برقرار رکھنے پر زور دیتے ہوئے متعدد مثالوں کے ساتھ کہا کہ اگر افسانہ نگار یہ توازن کھو دے تو پھر افسانہ بے کیف ہو کر رہ جاتا ہے۔ سماجی تبدیلیوں کے محرکات اقتصادی، اخلاقی یا کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں لیکن جب تبدیلیاں سامنے آتی ہیں تو ان سے تخلیق کار کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ ریسرچ اسکالر نورالہدیٰ، نسیم اختر، محمد شارق، خورشید، محمد خالد اور نفیس ضمیر نے بھی بحث میں حصہ لیا اور خصوصی مہمانوں کے دریافت کردہ سوالات کا جواب خاصے اعتماد کے ساتھ دیا۔ بحث کا محاکمہ کرتے ہوئے جلسے کے صدر اور سینئر ریسرچ اسکالر فتح عالم نے کہا کہ ادیب کی ذرا سی لغزش اس کی تحریر کو فحاشی کی حدود میں لے آتی ہے اور آج کے پیش کردہ افسانے میں اس کا اظہار برملا موجود ہے۔ خاص طور پر افسانہ نگار نے جن علامتوں کا سہارا لیا ہے مثلاً سفید کتا، کالی کتیا، چوہا، بلی وغیرہ۔ انھوں نے افسانہ نگار کو مشورہ دیا کہ وہ سامعین کی آرا کی روشنی میں اپنے افسانے پر نظر ثانی کریں اور ادب اور ابتذال کے درمیان تفریق کو اچھی طرح سمجھ کر ہی سیکس کے موضوع پر قلم اٹھائیں۔ نشست کے اختتام پر محمد شاہد نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

تخلیقِ ادب کے لیے مادری زبان میں تعلیم ناگزیر

● حیدر آباد۔ 12 اکتوبر، مسجد، مکتب، مطب دنیا کا سب سے پہلا اسلامی نظریہ ہے جسے عالمی تناظر میں دیکھا گیا۔ ہم دیکھتے رہ گئے یہود و نصاریٰ نے اپنا لیا۔ آج عالمی سطح پر مکتب، مطب کا اسلامی نظریہ چرچ سے وابستہ ہو گیا۔ خدمت خلق کے حوالے سے عالمی شہرت پا گیا اور اہل اسلام منہ دیکھتے رہ گئے۔ یعنی مفت تعلیم، مفت علاج و معالجہ جسے ہم نے فراموش کر دیا، غیر اقوام نے اپنا لیا۔ پروفیسر یوسف کمال نے مسدوسی ہال مغل پورہ میں ''اردو طرز تدریس اور ہمارے تعلیمی ادارے'' کے زیر عنوان ''بزم جوہر'' کے ماہانہ مذاکرے سے اپنے صدارتی خطاب کے دوران ان خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ ادب تخلیق کرنے کے لیے مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ زبان سے ادب ہے، جب زبان ہی نہیں تو ادب کہاں تخلیق ہوگا۔ آندھرا پردیش میں ایک لاکھ سرکاری اسکول ہیں جن میں صرف دو ہزار اردو اسکول ہیں یہ اردو والوں اور اردو اکیڈمی کے لیے لمحہ فکریہ ہے، جس کا کروڑوں میں سالانہ بجٹ ہے۔ اردو اکیڈمی کو چاہیے کہ اردو کے ماڈل پرائمری اسکولوں کا ریاست میں جال پھیلائے۔ ریاست میں مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی قائم کر دی گئی اس کی فیڈنگ کہاں سے آئے گی؟ ''قومی زبان'' کی اشاعت میں باقاعدگی اس میں شائع ہونے والی تخلیقات پر معقول معاوضے کی اجرائی کو یقینی بنایا جانا چاہیے۔ پروفیسر عقیل ہاشمی، صادق نوید، محمد علی حسینی اور مولانا نادر المسدودی مہمانانِ خصوصی تھے۔ ڈاکٹر راہی نے اپنے کلیدی نوٹ سے مذاکرے کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ملت اسلامیہ میں ماہرین تعلیم اور اہل ثروت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اگر وہ چاہیں تو ملی اتحاد کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے بچوں کے لیے اردو کے معیاری ماڈل اسکولوں، عصری اور دینی علوم کے ساتھ موظف ماہرین تعلیم کو لے کر شروع کر سکتے ہیں۔ پروفیسر عقیل ہاشمی نے کہا کہ اردو دانی، اردو زبان دانی، اردو انشا کی مفت کلاسز ادارہ ادبیات اردو اور عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کے اشتراک سے چلانے کے باعث، اردو عوام حرف شناسی اور اخبار پڑھنے کے لائق ہو گئے ہیں۔ اردو انشا کے بعد اردو عالم، اردو فاضل اور اردو ادیب کے امتحانات دینا چاہتے ہیں لیکن پرانے شہر کے قلب میں واقع اردو گھر میں ان کلاسز کا انتظام ہوتا تو سہولت کا باعث ہوتا۔ صادق نوید نے اردو تدریس کے بارے میں اپنے تدریسی طریقے اور تجربے بیان کیے اور کہا کہ سینٹ جارج گرامر اسکول، کالج ایسے تعلیمی ادارے ہیں جہاں دوسری زبان بطور اردو پڑھائی جا رہی ہے۔ محمد علی حسینی نے کہا کہ اردو اساتذہ نے اردو کا بیڑہ غرق کر دیا۔ حکومت کے ناعاقبت اندیشانہ فیصلے کے تحت تعلیم کو خانگی شعبے کے حوالے کر دینا ہی تعلیم کو تجارت بنا دینا ہے۔ مولانا نادر المسدودی نے بھی حاضرین سے خطاب کیا۔ پروفیسر عقیل ہاشمی کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ محبوب علی خان اخگر، پروفیسر یوسف کمال اور پروفیسر عقیل

ہاشمی کے علاوہ ڈاکٹر راہی، ہادی نوید، شوکت علی داد، کامل حیدرآبادی، رحیم مقبول، اثر چشتی، نادر المسدودی، انجم شافعی، یوسف روش، حامد رضوی اور مخلص علی عادل نے کلام پیش کیا۔ (منصف، حیدرآباد)

اردو کا پہلا اخبار ٹیپو سلطان نے جاری کروایا تھا

● منگلور۔ 21 نومبر، مقامی مولانا ابوالکلام آزاد اکیڈمی کے زیر اہتمام عظیم مجاہد آزادی ٹیپو سلطان کے یوم پیدائش پر ایک تقریب کا اہتمام جامعہ اصلاح البنات منگلور میں کیا گیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر ممتاز سماجی ورکر ڈاکٹر ایس اے عزیز نے شرکت کی جبکہ نظامت کے فرائض نسیم منگلوری نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی مسٹر عزیز نے کہا کہ ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلمانوں کا حصہ بہت نمایاں رہا ہے، مسلمانوں نے جنگ آزادی میں رہنما کا کردار ادا کیا ہے۔ اس کی وجوہات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ انگریزوں نے جس وقت ہندوستان پر قبضہ کرنا شروع کیا تھا اس وقت ہندوستان کے فرماں روا مسلمان ہی تھے۔ انھوں نے کہا کہ جس شخص نے سب سے پہلے اس خطرے کو محسوس کیا تھا وہ میسور کا بلند ہمت، بلند نگاہ اور غیور فرماں روا ٹیپو سلطانؒ تھا، جس نے اپنی بالغ نظری اور غیر معمولی ذہانت سے محسوس کرلیا تھا کہ انگریز رفتہ رفتہ پورے ملک پر قابض ہوجائیں گے اگر کوئی منظم طاقت ان کے مقابلے کے لیے سامنے نہ آئی۔ انھوں نے کہا کہ اس عظیم مجاہد آزادی کے اس قول ''گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے'' سے آج بھی شجاعت کی خوشبو آتی ہے۔ ٹیپو سلطانؒ نے مذہبی رواداری اور وسیع القلبی کی بھی شاندار روایت قائم کی۔ اس کی مذہبی فراخ دلی اور ہندوؤں کے ساتھ مکمل رواداری کی تاریخ ناقابل فراموش ہے۔ انھوں نے کہا کہ سلطان ٹیپوؒ کی زندگی کے دو اہم پہلو تھے ایک حب اسلام، دوسرے حب وطن اور حقیقت میں یہ دونوں اصول ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ قاری نسیم منگلوری نے کہا کہ شہید سلطان ٹیپوؒ دنیا کے تمام حکمرانوں میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کا سترہ سالہ دور اقتدار یوں تو پوری طرح وطن عزیز اور مذہب کے دشمنوں کے ساتھ میدان جنگ میں گزرا ہے لیکن اس کے باوجود سلطان کے علمی شوق وجستجو کا یہ عالم تھا کہ جنگوں میں مسلسل مصروفیت کے باوجود پینتالیس سے زائد مختلف موضوعات پر مشتمل کتابیں ہیں جن میں سے کچھ کو تو خود تحریر کیں اور کچھ کو اپنی سرپرستی میں کسی معتمد شخص سے تحریر کرایا، جن میں تحفۃ المجاہدین، مفتاح القلوب، فقہ محمدی، زادالمجاہدین، جواہر القرآن، رکوعات قرآن قابل ذکر ہیں۔ قاری نسیم منگلوری نے کہا کہ ہندوستان میں اردو زبان کا پہلا اخبار جاری کرنے کا سہرا بھی ٹیپو سلطان کے ہی سر ہے۔ 1794 میں ٹیپو سلطانؒ نے اردو اخبار جاری کرایا تھا۔ جس کا نام ''فوجی اخبار'' تھا اور یہ ہفت روزہ تھا۔ یہ اخبار خاص طور پر فوجیوں کے لیے تھا۔ اس میں جہاد کے متعلق مضامین اور وطن کے دفاع سے متعلق مختلف لوگوں کی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ یہ اخبار سلطان کی شہادت تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ سقوط سری رنگا پٹنم کے بعد انگریزوں نے اس اخبار کی تمام فائلوں اور سازوسامان کو نذر آتش کر دیا تھا۔ سلطان ٹیپو کو ملک کے سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام نے دنیا کا پہلا راکٹ موجد قرار دیا ہے۔ اور مورخ رمن سریشٹھ کے مطابق انگریز سری رنگا پٹنم سے دو راکٹ برٹین میوزیم کی آرٹ گیلری میں نمائش کے لیے لے گئے تھے۔ مولانا رئیس احمد کلیری نے کہا کہ بدعات وخرافات سے سلطان کی طبعی نفرت اور ان کے تقویٰ و پاکبازی وغیرہ کے تفصیلی حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک سچے مبلغ اسلام اور داعی حق کے روپ میں اسلامی تاریخ کے نامور فرزندان کی فہرست میں شامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ذاتی طور پر سلطان کی دینداری کا یہ عالم تھا کہ جنگوں میں مسلسل مصروف رہنے کے باوجود بلوغ کے بعد اس کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ سلطان بلاناغہ فجر کے بعد قرآن کی تلاوت کرنا نہیں بھولتے تھے۔ تقریب میں مبین انصاری، عبدالقیوم، خورشید احمد قاری، محمد مکرم کاسپوری، قاری منیر عالم، تسلیم احمد انصاری، ناظم خان، وسیم ملک، محمد اکرام انصاری، ارشاد انصاری، قاری محمد مستقیم انصاری اور اسرار احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (ہمارا سماج، دہلی)

مدارس کے طلبہ کے لیے صحافت ضروری

● دیوبند۔ 26 نومبر، دارالعلوم وقف دیوبند میں عصر حاضر کے تقاضوں کے تحت جن تین شعبوں کا قیام عمل میں آیا ہے، ان میں باقاعدہ کمپیوٹر ٹریننگ انگریزی تعلیم اور شعبۂ ادب وصحافت تندہی سے مصروف کار ہیں۔ شعبۂ ادب و صحافت میں طلبہ نے غیر معمولی دلچسپی دکھائی ہے۔ اس وقت تقریباً 50 طلبہ صحافت کی تربیت پا رہے ہیں، صحافت کے بڑھتے ہوئے قدم، پرنٹ میڈیا کی اہمیت و افادیت اور موجودہ اسلوب میں اپنی بات ادا کرنے کا سلیقہ اور فن سکھلانے کے لیے یہ شعبہ لازمی تھا، ذمے داران دارالعلوم وقف نے یہ قدم اٹھا کر ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کی ہے۔ شعبے کے افتتاح کے موقعے پر دارالعلوم وقف کے نائب مہتمم و استاذ حدیث مولانا محمد سفیان قاسمی نے کہا کہ صحافت ایک مقدس پیشہ ہے، جس کے تقدس کو باقی رکھنا آپ کے لیے ضروری ہے، یہ دودھاری تلوار ہے، جس کے دو پہلو ہیں یعنی مثبت اور منفی۔ آپ مثبت پہلو سے صحافت کا حق ادا کریں، قلم کی نگہبانی اس طرح سے کی جاسکتی ہے کہ آپ مصلحتوں سے سمجھوتہ نہ کریں اور اپنے دامن پر دروغ گوئی کا داغ نہ لگنے

دیں۔ مولانا سفیان قاسمی نے مزید کہا کہ ہمارے مدارس اردو کی ترقی، ترویج اور بقا میں بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں، مگر افسوسناک صورت حال یہ ہے کہ ان کی خدمات کا اعتراف کرنے والا کوئی نہیں۔ انھوں نے کہا ہر سال اردو کی لاکھوں کتابیں ان ہی مدارس کے طلبہ اور اساتذہ خریدتے ہیں، رسائل و جرائد اور اخبارات کی خریداری میں بھی ان کا نمایاں حصہ ہے۔ واضح رہے کہ اس شعبے کے نگراں و ذمے دار کی حیثیت سے معروف اردو ادیب وصحافی مولانا سید نسیم اختر شاہ قیصر استاذ دارالعلوم وقف کا انتخاب عمل میں آیا ہے، اس میدان میں ان کے تجربے اور صلاحیتوں سے قوی امید کی جاسکتی ہے کہ یہ شعبہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا۔ (ہمارا سماج، دہلی)

اردو یاد آئی

● لکھنؤ۔ 20 نومبر، اتر پردیش کی وزیر اعلیٰ مایاوتی نے ریاست کے تمام محکموں کے ذمے داروں کو واضح طور پر ہدایت دی ہے کہ وہ ریاست کی دوسری سرکاری زبان اردو میں کام کاج کو یقینی بنانے کے لیے مناسب کارروائی کریں نیز ریاست کا سرکاری کام کاج اردو میں بھی کیا جائے۔ اس کے لیے ریاست میں پہلے سے بھرتی اردو مترجمین کی خدمات کو بروئے کار لایا جائے۔ حکومت نے اس سلسلے میں ایک سرکاری حکم نامہ بھی جاری کر دیا ہے۔ یاد رہے کہ 1989 میں یوپی کی نرائن دت تیواری حکومت نے اراضی کی رجسٹری ریونیو ریکارڈ، سرکاری دفاتر میں سائن بورڈ، افسران کے ناموں وغیرہ کی تختیاں لگانے کے لیے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا تھا۔ بعد میں ملائم سنگھ یادو نے 1995 میں تقریباً چار ہزار اردو مترجمین اور پانچ ہزار سے زائد اردو اساتذہ کی تقرری کی تھی۔ سول سکریٹریٹ سے لے کر مختلف سرکاری دفاتر میں اردو کے بورڈ، تختیاں، سڑکوں کے نام رجسٹریاں اردو میں کی جانے لگی تھیں، لیکن بعد کی حکومتوں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب سرکاری دفاتر میں اردو کے نام کی تختیاں نہیں رہ گئی ہیں۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے اسمبلی انتخابات میں مایاوتی نے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ مراعات دیں گے لیکن ابھی تک انھیں کچھ نہیں دیا گیا ہے۔

(ہمارا سماج، دہلی)

اردو کے تئیں مخالفانہ رویہ

● مظفر نگر۔ 21 نومبر، ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی ایک اہم میٹنگ ضلع دفتر سٹی سینٹر میں منعقد ہوئی جس کی صدارت ضلع صدر کلیم احمد تیاگی نے کی۔ سکریٹری ڈاکٹر سلیم احمد سلمانی نے نظامت کے فرائض انجام دیے جبکہ مہمانِ خصوصی کے طور پر ڈاکٹر شمیم الحسن نے شرکت کی۔ میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے کلیم تیاگی نے کہا کہ ادھر اردو کے ساتھ ہونے والی دشمنی کی لہر میں جو تیزی آئی ہے وہ قابل افسوس ہی نہیں قابل مذمت بھی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ حکومت نے اتر پردیش سے اردو کو مکمل طور پر ختم کرنے کا قصد کر رکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میڈیم اسکولوں سے اردو کو ختم کر دیا گیا ہے۔ یہ سب اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کے بعد ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مظفر نگر ضلع میں 15 اردو میڈیم اسکول ہیں جو کہ صرف کاغذوں پر چل رہے ہیں۔ ایک بھی اردو میڈیم اسکول میں اردو میڈیم سے تعلیم نہیں دی جارہی ہے۔ انھوں نے پرائمری اسکولوں کی تعداد گنواتے ہوئے کہا کہ شہری علاقوں میں 2 اسکول کھالا پار میں 3 اسکول کیرانہ میں اردو میڈیم کے نام سے چل رہے ہیں۔ ان اسکولوں میں تعینات اردو اساتذہ اردو کے نام پر تنخواہ لے رہے ہیں لیکن ان اسکولوں سے اردو کا مکمل طور سے صفایا کر دیا گیا ہے۔ ان اردو میڈیم اسکولوں کا بورڈ تک اردو میں لکھا ہوا نہیں ہے۔ الغرض اردو کے ساتھ مسلسل ناانصافی کی جارہی ہے لیکن اردو کے حق میں آواز بلند کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ سیاسی پارٹیاں جو اردو اور مسلمانوں کی ہمدرد نظر آتی ہیں، ہمارے وہ سیاسی رہنما جو اردو گھرانوں کے دم پر برسراقتدار ہیں، وہ بھی اردو کو لگاتار نظر انداز کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے عہدیداران، اردو تنظیموں سے جڑے محبان اردو، شعرا حضرات وغیرہ سب کے سب خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ کیا کسی میں اتنا حوصلہ نہیں کہ حکومت سے یہ پوچھے کہ اردو میڈیم اسکولوں سے اردو کو مٹانے کی سازش کیوں کی جارہی ہے؟ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر شمیم الحسن نے کہا کہ تمام محبانِ اردو کو متحد ہو کر اردو میڈیم اسکولوں میں اردو میڈیم سے ہی تعلیم دلائی جانے، اردو بی.ٹی.سی. شروع کرائے جانے، اردو کی کتابیں دستیاب کرانے، اردو کو حقیقتاً دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہیے تاکہ اردو کو اس کا واجب حق حاصل ہو سکے۔ ہمیں اپنے روزمرّہ کے کاموں میں بھی اردو کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ کم سے کم روزانہ اپنے گھروں میں ایک اردو کا اخبار آنا چاہیے جس سے ہمارے بچوں میں اردو کے تئیں ذوق پیدا ہو۔ اس موقعے پر سلیم احمد سلمانی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (صحافت، دہلی)

اردو کے زیادہ سے زیادہ استعمال کی اپیل

● سیدنگلی۔ 29 نومبر، فاطمہ ایجوکیشنل سوسائٹی کے سربراہ سید قمر رضا باقری نے تمام محبان اردو سے اپنا ہر کام اردو زبان میں کرنے کی پرزور اپیل

کی ہے۔ سوسائٹی کی مجلس خاص میں باہم اتفاق رائے سے ان کی اپیل کو قبول کیا گیا کہ اردو زبان کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی جائے کیونکہ اردو دوسری سرکاری زبان ہے۔ اردو کی پیدائش اور نشو ونما میں یوپی کا اہم مقام رہا ہے اور یوپی ہی میں اردو زبان کی حالت غیر ہوتی جارہی ہے۔ یہاں اردو ترقی کرنے کے بجائے تنزل کی طرف گامزن ہے۔ اردو داں افراد کوئی بھی کام اردو میں کرتے ہوئے ہچکچا رہے ہیں۔ سوسائٹی کی مجلس میں ناز ایجوکیشنل سوسائٹی کے سربراہ ناظم حسین خان اور ارم ایجوکیشنل سوسائٹی سنبھل کے سربراہ ذاکر حسین نے بھی اس مہم کو کامیاب کرنے میں اپنا تعاون دینے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے تمام اردو اداروں کو اس مہم میں شریک ہونے کی دعوت دی ہے۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سید قیصر رضا نے ایک طویل خط رجسٹرار جامعہ اردو کو تحریر کیا ہے جس میں سبھی کام اردو زبان میں کرنے کی ان سے پرزور اپیل کی ہے اور تمام سینئر انچارجوں کو بھی تمام کام اردو زبان میں کرنے کی تلقین کی ہے۔ مزید یہ بھی کہا ہے کہ جامعہ اردو علی گڑھ اردو کا ادارہ ہے لیکن جامعہ اردو میں تمام حکم انگریزی میں صادر کیے جاتے ہیں جو اردو زبان کے ساتھ کھلا ہوا ظلم ہے۔ اگر جامعہ اردو میں اردو میں کام نہیں ہوں گے تو پھر کہاں ہوں گے، کیا دوسری زبان کے ادارے اردو میں کام کریں گے۔ تینوں ایجوکیشنل سوسائٹیوں کے اراکین نے الہ آباد میں پوسٹ آفس کی رو سے اردو زبان میں رسید کاٹ کر دیے جانے کا خیر مقدم کیا ہے اور کہا کہ اگر اردو داں عوام اپنے تمام کام اردو میں کرنے لگیں تو ریاستی و مرکزی حکومتوں کو اپنے دفاتر میں اردو ملازمین کی تقرری لازماً کرنا پڑے گی۔ اگر لفافوں پر پتے اردو میں لکھیں تو ڈاک خانوں میں اردو مترجمین کی تقرری کرنا ہی پڑے گی اسی طرح دیگر محکموں میں بھی۔ اس سے بے روزگاروں کو روزگار ملے گا اور اردو زبان روٹی روزی سے جڑے گی اور خود بخود فروغ پاتی رہے گی۔ سوسائٹی کی اس اہم مجلس کی صدارت ناز ایجوکیشنل سوسائٹی سنبھل کے سربراہ ذاکر حسین صاحب نے کی۔ حاضرین مجلس میں خصوصاً خادم رضا غلام حیدر رضوی، ذیشان علی، صادق رضا، محمد اجمل حسن، مہدی اکرم علی، معراج رضا وغیرہ موجود تھے۔

(صحافت، دہلی)

اردو میں پوسٹل رسید دیے جانے کا خیر مقدم

● مظفر نگر۔ ادبی، ولسانی شاخ مظفر نگر، اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی شاخ مظفر نگر کے ضلع صدر کلیم احمد تیاگی نے ایک میٹنگ میں الہ آباد پوسٹ آفس کے ذریعے اردو زبان میں رسید کاٹ کر دیے جانے کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ اگر پانچ ریاستوں (آندھرا پردیش، بہار، اتر پردیش، دہلی، جھارکھنڈ) کے اردو داں عوام کوشش کریں، تو مرکزی حکومت کو اپنے دفاتر میں ملازمین کی تقرری کے لیے اردو کا علم لازمی کرنا پڑے گا اور ڈاکخانوں میں اردو ٹرانسلیٹرز کی تقرری بھی کرنا پڑے گی۔ کیونکہ ہندوستان کی مذکورہ پانچوں ریاست نے اردو کو علاقائی زبان تسلیم کرتے ہوئے اسے دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا ہے۔ مگر پہلی سرکاری زبان کی طرح دوسری سرکاری زبان اردو کی تعلیم کو کسی بھی ریاست نے لازمی قرار نہیں دیا ہے۔ جو فرقہ پرستی کا ثبوت ہے۔ اتر پردیش سے دہلی کے تین اعلیٰ آفیسروں کو روانہ کیے گئے اسپیڈ پوسٹ لیٹر کی اردو میں کاٹی گئی رسید کی فوٹو کاپی اردو اخبارات کو مہیا کراتے ہوئے تنظیم کے صدر کلیم تیاگی نے کہا کہ اگر ہم اردو داں عوام یعنی شاعر، ادیب نقاد، مراسلہ نگار، صحافی، ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، پروفیسر، ریڈر، لیکچرار اور سرکاری ملازمین اپنی زبان کی بقا کے لیے بیدار ہو جائیں اور اپنا ہر کام اردو زبان میں ہی کرنے لگیں تو مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کو قانون اردو (آفیشیل لینگویج ایکٹ) کو نافذ کرنا ہی پڑے گا لیکن ہم اردو داں عوام احساس کمتری کے شکار ہیں کہ اردو کا استعمال کرنا جاہلیت کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ (اخبار مشرق، دہلی)

قومی اردو کونسل کی موبائل وین دوبارہ 2009 سے شروع

● نئی دہلی۔ 18 دسمبر، ہندوستان کے مختلف خطوں میں اردو کتابوں کی فراہمی کے مسائل کو دیکھتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے 2002 میں NBT کے تعاون سے موبائل وین کا سلسلہ شروع کیا تھا جس کو اردو قارئین کی اکثریت نے سراہا اور اس وین نے ہندوستان کے کئی اہم صوبوں کا دورہ کیا اور اردو قارئین نے بڑی تعداد میں اس وین سے اپنی پسند کی کتابیں خریدیں لیکن یہ سلسلہ 2002 کے بعد جاری نہ رہ سکا، کونسل نے اس وین کی پذیرائی کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اپنی وین تیار کرائے جو پورے ہندوستان کا دورہ وقتاً فوقتاً کرتی رہے تاکہ طلبہ اور اساتذہ کو کتابیں مناسب قیمت پر فراہم کرائی جاسکیں اور اس سے اردو کے وہ ادارے بھی استفادہ کرسکیں جو ان شہروں اور گاؤں میں اردو کے لیے کام کررہے ہیں جہاں آمد ورفت کے وسائل آسانی سے دستیاب نہیں ہیں۔ قومی اردو کونسل کی کئی برسوں کی محنت کے بعد اب یہ وین تقریباً تیار ہو چکی ہے اور امید ہے کہ 2009 سے یہ وین ہندوستان کے مختلف شہروں اور دیہی علاقوں کا دورہ شروع کردے گی۔ اس میں قومی اردو کونسل کی تمام مطبوعات نمائش اور فروخت کے لیے رکھی جائیں گی اور ان کتابوں پر طلبہ اور اساتذہ کو حسب معمول رعایتیں بھی دی جائیں گی۔ اس سلسلے میں کونسل کی درخواست ہے کہ آپ اپنے شہر اور گاؤں میں کام کرنے والے اردو کے اداروں، اسکولوں،

کالجوں، لائبریریوں اور مدرسوں کے پتے کونسل کو بھیج دیں تاکہ کونسل کی وین ان علاقوں کا بھی دورہ کر سکے۔

مختصرات

● حیدر آباد۔ 24 اکتوبر، زندہ دلان حیدر آباد کے ترجمان ماہنامہ "شگوفہ" کے 40 ویں سال کے اختتام کے موقعے پر ممتاز مزاح نگار و کالم نگار ڈاکٹر عابد معز کے فکر و فن اور شخصیت کے جائزے پر مشتمل ایک ضخیم اور خوب صورت نمبر کی رسم اجرا جناب نریندر لوتھر کے ہاتھوں کل رات اردو ہال حمایت نگر میں عمل میں آئی۔ پدم شری مجتبیٰ حسین نے جلسے کی صدارت کی اور کہا کہ عابد معز کا "شگوفہ" سے بہت پرانا تعلق ہے۔ وہ اچھے انشائیہ نگار ہیں۔ کالم نگاری بہت سخت کام ہے لیکن عابد معز نہایت آسانی کے ساتھ یہ کام انجام دے رہے ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں میں "شگوفہ" کو پرانا بنانے میں عابد معز کا اہم کردار رہا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے کہا کہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال 1968 سے بڑی پابندی کے ساتھ "شگوفہ" شائع کر رہے ہیں جو ایک اہم اور مشکل کام ہے۔ نامور طنز و مزاح نگار نریندر لوتھر نے کہا کہ اگر اولمپکس میں اردو شامل ہوتی تو طنز و مزاح کا گولڈ میڈل "شگوفہ" کو ہی ملتا جس کے 40 سالہ سفر میں کئی نئے لکھنے والے روشناس ہوئے۔ مہمان خصوصی محمد علی رفعت اور پروفیسر یوسف کمال نے مدیر شگوفہ کو مبارکباد پیش کی کہ وہ چالیس سال سے توقف کے بغیر "شگوفہ" شائع کر رہے ہیں۔ پروفیسر کمال نے عابد معز کو ایک ہمہ جہت شخصیت قرار دیا۔ پروفیسر اشرف رفیع نے کہا کہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے "اودھ پنچ" کا ریکارڈ توڑ دیا اور شگوفہ کے ذریعے طنز و ظرافت کو ایک نیا وقار بخشا۔ انھوں نے کہا کہ عابد معز کا مزاح ایسا نہیں ہے کہ آدمی ہنسنے پر مجبور ہو۔ وہ پیشے کی مناسبت سے نشتر زنی کرتے ہیں۔ ممتاز شاعر طالب خوندمیری اور رشید سمیع جلیل نے عابد معز پر منظوم خاکے سنائے۔ ابتدا میں مدیر "شگوفہ" نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ عابد معز نے "شگوفہ" کے مفتوحہ علاقوں کو وسعت دی۔ شگوفہ کا خصوصی نمبر عابد معز کے تمام کارناموں کا احاطہ کرتا ہے۔ کنوینر جلسہ ایف. ایم. سلیم نے کہا کہ "شگوفہ" نے کئی نمبر شائع کیے ہیں اور عابد معز شگوفہ کی 28 ویں خصوصی اشاعت ہے۔ (منصف، حیدر آباد)

● گلبرگہ۔ 12 نومبر، مولانا ابو الکلام آزاد نے "الہلال" اور "البلاغ" کے ذریعے اپنے فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے نہ صرف خوابیدہ ذہنوں کے لیے تعمیر کا کام کیا بلکہ مسلمانوں میں یہ احساس بھی پیدا کیا کہ ملک کی آزادی کے لیے جدو جہد کرنا ان کا ایک فریضہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر بیگ احساس، صدر شعبۂ اردو سینٹرل یونیورسٹی، حیدر آباد نے انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے جلسۂ تقسیم انعامات میں 11 نومبر کو "خواجہ بندہ نواز ایوان اردو" میں کیا۔ جلسے کی صدارت صدر انجمن، جناب ولی احمد نے کی۔

اس موقعے پر ڈاکٹر ایس. ایم. انعامدار نے انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے سالانہ ترجمان "انجمن" کی رسم اجرا انجام دی۔ جناب حامد اکمل مدیر "انجمن" نے مجلس ادارت کے علاوہ جناب اکرم نقاش اور جناب اعجاز مصور کی معاونت کے لیے اظہار تشکر کیا۔ جناب سید سجاد علی نے جلسے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی ترقی اور اس کے مطالبات کے حصول کے لیے تمام اردو داں حضرات کو مل کر متحدہ طور پر تحریک چلانا چاہیے تاکہ دوسری سرکاری زبان کے طور پر نظم و نسق میں اردو کو اس کا صحیح مقام مل سکے۔ ڈاکٹر ایس. ایم. انعامدار نے انجمن کی خدمات کو سراہتے ہوئے تجویز پیش کی کہ اردو کے دانشوروں اور خدمت گزاروں کو چاہیے کہ وہ مشترکہ مساعی کے ذریعے اردو کے مسائل کی یکسوئی کے لیے کام کریں۔ انھوں نے کہا کہ بہت سارے ذہین طلبہ وقت سے پہلے تعلیمی سلسلہ منقطع کرتے ہیں، انجمن اور دیگر اہل خیر حضرات ایسے غریب مگر ذہین و باصلاحیت طلبہ کے تعلیمی سلسلے کو جاری رکھنے کا اہتمام کریں۔ جناب حکیم شاکر مدیر روز نامہ "سلامتی" نے انعام پانے والوں سے کہا کہ اردو طلبہ کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، جو طلبہ انگریزی کے ذریعے تعلیم حاصل کر رہے ہیں انھیں بھی چاہیے کہ اردو کو بطور اختیاری مضمون پڑھیں۔ جناب ولی احمد نے مولانا آزاد کے یوم ولادت کو "یوم تعلیم" کے طور پر منانے کے حکومتی احکام کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ دور حاضر میں مولانا کے تعلیمی نظریات کی تشہیر ہمارا اولین فریضہ ہے۔ انھوں نے انجمن کے تعلیمی فنڈ میں فراخدلانہ عطیات کی اپیل کی۔

امتحان مارچ 2008 پی. یو. سی. سال دوم، پارٹ۔ا کے تحت اردو مضمون میں سب سے زیادہ نشانات حاصل کرنے والی طالبہ کو جناب وہاب عندلیب کے ہاتھوں گولڈ مڈل و توصیفی سند سے نوازا گیا۔ یہ خوش نصیب طالبہ ہیں رحیدہ جے. ٹانکیواڑی جنھوں نے اردو مضمون میں 98/100 نشانات حاصل کیے۔ دوسرا انعام طالبہ حنا کوثر نے حاصل کیا۔ یہ ایوارڈ نائب صدر انجمن جناب حمید سہروردی نے پیش کیا۔ انھوں نے بھی اردو مضمون میں 98/100 نشانات حاصل کیے، تیسرا انعام طالبہ فاطمہ حفصہ کے حصے میں آیا۔

ایس. ایس. ایل. سی. امتحان مارچ، 2008 میں امتیازی نشانات حاصل کرنے والی طالبہ عطیہ حنا کو ادارۂ سیاست، حیدر آباد کی جانب سے "سیاست گولڈ مڈل" جناب کلیم شاکر نمائندہ سیاست کے ہاتھوں پیش کیا گیا۔ عطیہ حنا نے %90.88 فیصد نشانات حاصل کیے۔ دوسرا انعام پانے والی طالبہ عائشہ عنبرین کا تعلق گلبرگہ سے ہے، انھوں نے %90.56 فیصد نشانات حاصل

کیے۔ یاسمین سلطانہ نے تیسرا انعام حاصل کیا۔ انھوں نے 87.52% فیصد نشانات حاصل کیے۔ ان دونوں طالبات کو مہمان خصوصی ڈاکٹر ایس. ایم. انعامدار نے ''سیاست سلور میڈل'' عطا کیے۔ جناب سید سجاد علی انعامدار کارپوریٹر کارپوریشن گلبرگہ نے اپنی جانب سے مذکورہ بالا تینوں طالبات کو علی الترتیب دو ہزار روپے، ڈیڑھ ہزار روپے اور ایک ہزار روپیوں کے رقمی انعامات عطا کیے۔

اسی طرح درج بالا امتحان میں ضلع گلبرگہ کی سطح پر امتیازی نشانات کی حامل طالبات کو البدر ایجوکیشنل ٹرسٹ گلبرگہ کی جانب سے عطیہ حنا بی بی، رضا گرلز ہائی اسکول، گلبرگہ کو انعام اول -/2500 روپے، عائشہ عنبرین ہومن ایچ. ہائی اسکول گلبرگہ کو انعام دوم -/1500 روپے اور امامہ بختیار، نیشنل گرلز ہائی اسکول، گلبرگہ کو تیسرا انعام -/1000 روپے مہمان خصوصی جناب مقصود علی ہاشم بینار ٹرسٹی و خازن البدر ٹرسٹ کے ہاتھوں پیش کیے گیے۔ امامہ بختیار نے 566/625 یعنی، 86.72% فیصد نشانات حاصل کیے۔

ایس. ایس. ایل. سی. امتحان مارچ، 2008 میں شہر گلبرگہ کی سطح پر زبان اول اردو میں امتیازی نشانات حاصل کرنے والی پانچ طالبات کو انجمن کی جانب سے رقمی انعامات سے نوازا گیا۔ پہلا انعام طالبہ آفرین سلطانہ نے حاصل کیا۔ انھوں نے اردو میں 122/125 نشانات حاصل کیے، دوسرا انعام طالبہ عارفہ بیگم کو ملا انھوں نے 121/125 نشانات حاصل کیے اور تیسرا انعام طالبہ فردوس فاطمہ کے حصے میں آیا۔ انھوں نے 120/125 نشانات حاصل کیے چوتھا انعام طالبہ رخسار انجم نے حاصل کیا۔ انھوں نے 120/125 نشانات حاصل کیے، پانچواں انعام طالبہ اسماء نکہت نے حاصل کیا۔ انھوں نے 120/125 نشانات حاصل کیے، یہ انعامات مہمانان خصوصی کے ہاتھوں دیے گئے۔

جلسے کا آغاز ثوبیہ متعلمہ دہم ہومن ایچ. ہائی اسکول کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔ ناظم جلسہ جناب امجد جاوید، نائب صدر انجمن نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ جناب محمد افتخار الدین اختر نے مہمانوں کا تعارف کروایا۔ جناب محمد مجیب احمد نے انعامات پانے والی طالبات کی تفصیل اور ناموں کا اعلان کیا۔ آخر میں میر شاہ نواز شاہین، معتمد تنظیمی کے شکریے پر جلسے کا اختتام عمل میں آیا۔

(ڈاک سے)

● حیدر آباد۔ 12 نومبر، اردو زبان کی بقا و ترویج کے لیے حکومتوں یا برسر اقتدار اشخاص پر انحصار کرنے کے بجائے اردو داں طبقے کے سرپرستوں اور اولیائے طلبہ کو چاہیے کہ نئی نسل میں کم سے کم ابتدائی اور ثانوی جماعتوں میں اردو ذریعۂ تعلیم کو فروغ دیں۔ اس تحریک کا آغاز کرتے ہوئے ''ادارۂ سیاست'' نے زبان دانی اردو دانی جیسے امتحانات منعقد کرتے ہوئے ہزاروں لوگوں کو اردو سیکھنے کی ترغیب دی، جس کے کامیاب نتائج برآمد ہوئے۔ اسی طرح طلبہ کے سرپرستوں کو بھی چاہیے کہ اردو مادری زبان رکھنے والے طلبہ کو اردو ذریعۂ تعلیم کی طرف راغب کریں اور ثانوی جماعتوں تک ہی سہی اردو ذریعۂ تعلیم کو برقرار رکھیں۔ اردو بولنے والے ہر طالب علم کو روزانہ پندرہ منٹ اردو سیکھنے کے لیے پابند کریں تو یقیناً وہ طالب علم اردو لکھنا اور پڑھنا سیکھ سکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار محمد قمر الدین صابری اردو فاؤنڈیشن'' کے زیر اہتمام منعقدہ مذاکرے میں مقررین نے کیا اور ''اردو ذریعۂ تعلیم اور ہماری ذمہ داریاں'' کے عنوان پر سیمینار کے انعقاد کی ضرورت پر زور دیا تاکہ سیمینار کے ذریعے نئی نسل کو اردو کی افادیت و اہمیت سے واقف کروایا جا سکے۔ مذاکرے کی صدارت ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے کی اور بحیثیت مہمان خصوصی ڈاکٹر مجید بیدار اور پروفیسر میر تراب علی نے شرکت کی۔ ناظم ادبی اجلاس شفیع اقبال ایڈیٹر ''ہماری منزل'' نے اپنے ابتدائی کلمات میں کہا کہ اولیائے طلبہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہوئے بغیر اپنے بچوں کی ابتدائی جماعتوں کے لیے اردو ذریعۂ تعلیم کو اپنائیں۔ ڈاکٹر ایم. ایم. انور نے خیر مقدمی تقریر میں سہ لسانی، فارمولے کو اپنانے کی ترغیب دی۔ بعد ازاں ڈاکٹر مجید بیدار کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ جناب مومن خان شوق معتمد اردو فاؤنڈیشن نے مشاعرے کی نظامت کی۔ ممتاز شعرا ڈاکٹر عقیل ہاشمی، صادق نوید، عزیز ناگپوری، مومن خان شوق، شفیع اقبال، کامل حیدر آبادی، رحمت سکندر آبادی، ڈاکٹر ناقد رزاقی اور صدر مشاعرہ نے کلام سنایا۔ (منصف، حیدر آباد)

● حیدر آباد۔ 7 نومبر، بزم علم و ادب میں ناگپور کے ممتاز ناول نگار، ادیب وصحافی وکیل نجیب کی حیدر آباد آمد پر خیر مقدمی جلسہ و مشاعرے کا انعقاد 3 نومبر، بروز دوشنبہ، مغل پورہ میں عمل میں آیا۔ جلسے کی صدارت صلاح الدین نیر اور مشاعرے کی صدارت اثر غوری نے فرمائی، مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شاغل ادیب، رؤف خیر، ڈاکٹر بشیر احمد اور شاہ حسین نہری (اورنگ آباد)، ڈاکٹر خلیل صدیقی اور حمید الظفر نے شرکت کی، مقررین نے مجموعی تاثر یہ پیش کیا کہ 1857 کے بعد سے ناول نگاری کو فروغ ہوا، ناول کے ذریعے سماج اور حالات کی دلچسپ انداز میں عکاسی کی جاسکتی ہے اور اسی کام کو جناب وکیل نجیب بڑی ہی خوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ نادر مسدوی صدر، بزم علم و ادب نے خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ پانچ برسوں سے بزم میں ملک و بیرون ملک کے نامور شعرا و ادبا کا خیر مقدم کیا جاتا رہا ہے اور آج اس بزم میں نہ صرف وکیل نجیب (ناگپور) بلکہ ممتاز شاعر شاہ حسین (اورنگ آباد) اور ممتاز صحافی ڈاکٹر خلیل صدیقی کا بھی بزم میں خیر مقدم کرتے ہوئے مسرت محسوس ہو رہی ہے۔ پروگرام کا آغاز قاری یوسف روش کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔

نظامت کے فرائض نادر المسدوسی نے انجام دیے بعد ازاں اثر غوری کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے رؤف خیر، صلاح الدین نیر، بصیر افضل، افتخار عابد اور اطیب اعجاز نے شرکت کی اور کلام سنایا۔ ان کے علاوہ ممتاز شعرا یوسف روش، ڈاکٹر طیب پاشاہ قادری، نادر المسدوسی، انجم شافعی، اثر چشتی، شوکت علی درد، شاہ حسین نہری، وکیل نجیب، شاغل ادیب، طاہر گلشن آبادی، عزی شاہ، تجمل اظہر اور ڈاکٹر سلیم عابدی ناظم مشاعرہ نے کلام سنا کر سامعین سے داد و تحسین حاصل کی۔ اطیب اعجاز اور افتخار عابد نے صدر جلسہ، صدر مشاعرہ اور تمام مہمانوں کی گلپوشی کی۔

(منصف، حیدرآباد)

● نئی دہلی۔ 21 نومبر، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے زیر اہتمام قومی کتاب ہفتہ کے موقعے پر اردو میں بچوں کے ادب کی صورت حال پر انڈیا انٹرنیشنل سینٹر انیکسی میں ایک مباحثے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت اردو کے مشہور افسانہ نگار جوگیندر پال نے کی۔ پروگرام کے آغاز میں ڈاکٹر شمس اقبال نے اس مباحثے کی غرض و غایت اور اہمیت کو واضح کیا۔ پروفیسر ابن کنول نے اپنی تقریر میں کہا کہ اگر بچوں کے لیے عمدہ ادب پیش کیا جائے تو یقیناً بچے پڑھنا پسند کریں گے۔ غلام حیدر نے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہا کہ ہمارے یہاں اردو میں بچوں کا ادب موجود تو ضرور ہے لیکن اسے بچوں کے لحاظ سے اور معیاری بنانے کی ضرورت ہے۔ خورشید اکرم نے رتن سنگھ کی تصنیف کردہ اڑن کھٹولا پر تبصرہ کیا۔ اس تقریب میں رتن سنگھ اور جیلانی بانو نے بھی اپنے تجربے پیش کرتے ہوئے بچوں کے لیے بچہ بننے پر زور دیا تا کہ بہتر کہانی ان کے لیے لکھی جا سکے۔ صدارتی تقریر میں جوگیندر پال نے کہا کہ جب تک بچوں کے ادب پر خصوصی توجہ نہیں دی جائے گی ادب کا دامن خالی ہی محسوس ہوتا رہے گا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● مسلم ایجوکیشنل سوشل اینڈ کلچرل آرگنائزیشن کے زیر اہتمام ہاشمی پبلک اسکول چاند پور میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا، جس میں سی. بی. ایس. ای. بورڈ میں ہندی، انگریزی کی طرح اردو۔ عربی زبان کو بھی لازمی طور پر شامل کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس موقعے پر مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر فخر الدین محمد نے سینٹرل بورڈ آف سکینڈری ایجوکیشن (CBSE) میں اردو مضمون کو شامل کیے جانے کا مطالبہ کیا۔ نیز انھوں نے تکنیکی اداروں میں بھی اردو کو لازمی طور پر شامل کرنے کی مانگ کی۔ سیمینار کی صدارت سید حفیظ الحسن و نظامت وزیر حیدر نے کی اس موقعے پر اقبال حسنین، ڈاکٹر رفیق احمد، ڈاکٹر منیر خالد، شکیل جمالی، جمیل ولد عارف علی وغیرہ نے بھی اپنے اپنے نظریات پیش کیے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● باغپت۔ 21 نومبر، گذشتہ سرکاروں کی طرز پر صوبائی سرکار نے پھر ایک خط لکھ کر ضلع انتظامیہ کو کہا ہے کہ یو. پی. میں چوں کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملا ہوا ہے، اس لیے سرکاری مشنری اس کے واجب استعمال کو یقینی بنائے۔ اشوک گھوش نے ضلع مجسٹریٹ سمیت تمام سرکاری ملازمین و حکام سے کہا ہے کہ اردو کو سرکاری کام کاج میں استعمال کے لیے جو پہلے سے سرکلر جاری ہوئے ہیں، ان پر کہیں عمل نہیں ہوا ہے، اس لیے اب دوبارہ ان پر عمل کرنے کو کہا گیا ہے۔ ذرائع کے مطابق ضلع بھر میں جس طرح کھلم کھلا اردو کا بائیکاٹ کیا جا رہا ہے اس کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ ضلع مجسٹریٹ اور پولیس کپتان سے لے کر تمام دفاتر اور افسران کے نام کی تختی پر بھی اردو کا ایک لفظ تک نہیں لکھا گیا ہے، اردو میں درخواستوں کا قبول کرنا یا جواب دینا تو دور کی بات ہے۔ اس افسوس ناک صورت حال سے اردو داں طبقہ بے حد نالاں ہے اور سرکار کے اس نئے سرکلر کے بارے میں بھی وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے لیے تیار نہیں ہے۔ دوسری طرف تمام پرائمری اسکولوں میں اردو تعلیم پر پابندی برابر جاری ہے اور اردو زبان کے طلبہ کو سنسکرت پڑھنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● پٹنہ۔ 19 اکتوبر، خدا بخش لائبریری میں 19 اکتوبر، 2008 کو اردو کے نامور شاعر کرشن کمار طور کے ساتھ ایک شام کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت بہار کے کہنہ مشق شاعر ڈاکٹر کلیم احمد عاجز نے فرمائی۔ ڈاکٹر امتیاز احمد ڈائرکٹر، خدا بخش لائبریری نے حاضرین مجلس اور مہمان گرامی کا استقبال کرتے ہوئے لائبریری کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے روشناس کرایا۔ ڈاکٹر عبد الصمد، پرنسپل اورینٹل کالج نے کرشن کمار طور کا مختصر تعارف پیش کیا۔

کرشن کمار طور نے اپنے متعلق کہا کہ میں 11 اکتوبر، 1933 کو لاہور میں پیدا ہوا۔ ایم. اے. اردو کے علاوہ سیاحت اور ہوٹل مینجمنٹ کی پروفیشنل تعلیم بھی حاصل کی۔ میری مادری زبان پنجابی ہے لیکن میں اردو سے محبت کرتا ہوں اور اردو کا اسیر ہوں۔

اردو شاعری کے متعلق آپ نے کہا کہ اردو شاعری کا مستقبل بہت روشن نہیں ہے اگرچہ شاعروں کی بھیڑ پیدا ہو رہی ہے لیکن اس بھیڑ میں بہت کم نام ایسے ہیں جن سے کوئی امید وابستہ کی جا سکے۔ شعر کہنا ایک بھیڑ چال ہو گیا ہے کیوں کہ شاعری سستی شہرت کے حصول کا ذریعہ ہو گئی ہے۔ ہماری عمر کے لوگ خوب ریاضت کرتے تھے تب جا کر ایک مصرعہ کہنے کی انھیں توفیق ہوتی۔ گذشتہ پچاس برسوں سے اس وادی پر خار میں ہوں۔ غزل میرے لیے محبوب صنف ہے۔ تمام عمر میں نے غزل ہی کہی ہے۔ کلاسیکی شاعری کا دلدادہ رہا ہوں، بعد میں آپ نے اپنی غزلیں پیش کیں۔

اخیر میں صدر مجلس کلیم احمد عاجز نے اپنے صدارتی کلمات سے نوازا۔ اس کے بعد ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈائرکٹر، خدابخش لائبریری نے شعرائے کرام اور حاضرین مجلس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

(قومی تنظیم، پٹنہ)

● نئی دہلی۔ 14 نومبر، اردو زبان کے تحفظ و بقا کے لیے ضروری ہے کہ اسے معاش سے جوڑا جائے، ابھی صرف ہندی قلم ہی اردو کے لیے معاشی سہولت ہے لیکن اسے مزید بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار ایم. جے. اکبر نے جشن صد سالہ یوم ولادت عبدالحمید کے موقعے پر منعقدہ حکیم عبدالحمید میموریل (رولنگ) ٹرافی کے دوسرے سالانہ کل ہند بین المدارس اردو مباحثہ بعنوان ''دینی مدارس کے نصاب میں عصری تعلیم کی شمولیت ضروری ہے'' کے موقع پر جامعہ ہمدرد کے کنونشن ہال میں کیا۔ مہمانان خصوصی میں سلیم صدیقی، پروفیسر احسان خاں، اسلم پرویز، سید حامد، عبدالمعید، کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان مہمانوں کا استقبال رابعہ گرلز اسکول کے طلبہ نے گلدستہ پیش کر کے کیا۔ طلبہ نے علامہ اقبال کی نظم پیش کی۔ صدر انڈو قطر اردو مرکز (دوحہ/دہلی) محمد سلیمان دہلوی نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ یہ ڈیبیٹ مقابلہ اسکولی طلبہ کے مابین منعقد ہوا۔ ہر اسکول کے ایک طالب علم نے جس موضوع پر تقریر کی اسی اسکول کے دوسرے طالب علم نے اس موضوع کی مخالفت میں تقریر کی۔ مقابلے میں اے اے کے انٹر کالج، امروہہ (یو. پی.) کے طلعت انصاری اور عمر پرویز، علی گڑھ مسلم سینئر سکینڈری اسکول فار گرلز علی گڑھ کی طالبہ شجرہ فاطمہ اور فارحہ طارق، اینگلو عربک سینئر سکنڈری اسکول اجمیری گیٹ دہلی کے محمد شاوات اور محمد بشر، انجمن جونیئر کالج بھٹکل، کرناٹک کے رکن الدین اور محمد عاطف، انجمن اسلام ہائی اسکول ممبئی کے عبیدالرحمٰن انصاری اور حفظان احمد، کریسنٹ پبلک اسکول موج پور دہلی سے رومانہ اقبال اور عالیہ دہلوی، فتح پوری مسلم سینئر سکنڈری اسکول سے محمد محسن اور محمد ذیشان، گورنمنٹ سینئر سکنڈری اسکول نمبر 2 جامع مسجد سعدیہ اور عاتقہ، گورنمنٹ بوائز سینئر سکنڈری اسکول نور نگر، اوکھلا، سے محمد فیضان اور محمد نوشاد، ہمدرد پبلک اسکول تعلیم آباد نئی دہلی سے سعدیہ خاں اور عمرہ خاں، آئیڈیل انڈین اسکول دوحہ سے صفا فاطمہ صدیقی اور بشریٰ حسن، جامعہ سینئر سکنڈری اسکول (فرسٹ شفٹ) سے طیبہ راشد اور زیبا اسلام جامعہ سینئر سکنڈری (سیکنڈ شفٹ) سے صائمہ ناز اور ثنا بشیر، کائنات انٹرنیشنل اسکول، جہان آباد (بہار) سے عامر رضا اور عرشی عالم، ایم ای ایس انڈین اسکول دوحہ سے تسنیم نظیر احمد اور ثنا آرزو، نیو ہورائزن اسکول، نئی دہلی سے سیدہ نظامی اور اقرا نعیم، رابعہ گرلز پبلک اسکول دہلی سے نمرہ اور زینب علی، شفیق میموریل سینئر سکنڈری اسکول دہلی، محمد معراج اور محمد کامران اور حسن دے پبلک اسکول، رامپور کے طلبہ محمد انس شمسی اور عدیل عبداللہ نے حصہ لیا۔ مذکورہ بالا ہر اسکول کے طالب علم نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا اور دوسرے نے اس کی مخالفت میں تقریر کی۔ واضح رہے کہ اس میں کامیابی حاصل کرنے والے وپوزیشن لانے والے طلبہ کو انعامات سے نوازا جائے گا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اعزاز و اکرام

● نئی دہلی۔ 9 نومبر، یو این آئی اردو سروس ان ایوارڈ یافتگان میں شامل ہے جنھیں اردو کے مختلف شعبوں میں ان کی نمایاں کارکردگی کے لیے آج یہاں عالمی یوم اردو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ علامہ اقبال کے یوم پیدائش کی مناسبت سے عالمی یوم اردو کے موقعے پر اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن اور یونائیڈ مسلم آف انڈیا کی طرف سے منعقدہ تقریب میں دیا گیا۔ اس موقعے پر قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین جسٹس محمد سہیل اعجاز صدیقی، حریت کانفرنس کے رہنما سید علی شاہ گیلانی، شاہی فتح پوری مسجد کے امام ڈاکٹر مفتی محمد مکرم احمد، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر بصیر احمد، منصور عثمانی، پروفیسر بشیر احمد نحوی، رام پرکاش کپور، وصی احمد نعمانی، معصوم مراد آبادی اور سہیل انجم سمیت مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد موجود تھے۔ یو. این. آئی. اردو سروس کو اردو صحافت میں نمایاں خدمات کے لیے ایوارڈ دیا گیا۔ پینگوئین پبلیشرز کو اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ایوارڈ دیا گیا۔ خیال رہے کہ اس عالمی اشاعتی ادارے نے پہلی مرتبہ 2005 میں اردو زبان میں کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے اور اب تک دس کتابیں شائع کر چکا ہے۔ کٹک (اڑیسہ) کے مسٹر گوتم مترا کو ایوارڈ برائے ادب، مسٹر رضوان اللہ کو ایوارڈ برائے تعمیری صحافت اور مسٹر محمد ابوالفضل فاروقی کو ایوارڈ برائے تعلیمی خدمات دیا گیا۔ مسٹر فاروقی نوائیڈا میں ایم. اے. ایف. اکیڈمی کے بانی ہیں۔ اس اسکول کا پچھلے دو سال میں دسویں کلاس میں صد فیصد فرسٹ ڈویژن ریزلٹ رہا ہے اور اسکول میں پہلے درجے سے بارہویں درجے تک اردو مستقل سبجیکٹ پڑھانے کا انتظام ہے۔ اس موقعے پر ایک یادگاری مجلہ بھی شائع کیا گیا۔ تقریب کے منتظم ڈاکٹر سید احمد خان نے اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے تمام شرکا اور معاونین کا شکریہ ادا کیا۔ (قومی تنظیم، پٹنہ)

● بنگلور۔ 11 اکتوبر، کرناٹک انوواد ساہتیہ اکادمی کی جانب سے 13 اکتوبر کو 09-2008 کے لیے ترجمہ شدہ ادب و شاعری کے میدان میں خدمت انجام دینے والی منتخب ادبی شخصیتوں کو ایوارڈ پیش کیے گئے۔ اس مرتبہ اردو کے جانے مانے شاعر و ادیب ماہر منصور کا نام ان پانچ افراد کی فہرست

میں شامل ہے، جنھیں یہ ایوارڈ پیش کیے گئے ہیں۔ جناب ماہر منصور کا اصلی نام سید قادری محی الدین ہے جن کی پیدائش ٹمکور ضلع کے سرا میں 1947 ، میں ہوئی۔ وہ محکمہ ڈاک دتار میں خدمت انجام دے کر اسٹیٹ سوپرنٹنڈنٹ آف پوسٹ آفس کے عہدے تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔ میسور یونیورسٹی سے وہ انگریزی ادب میں ایم. اے. کورس کر رہے تھے تو اسی دوران ''تحریک'' کے مدیر گوپال متل نے ان کے انگریزی ادب کے ترجموں سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ اگر وہ علاقائی زبان کنڑ ادب وشاعری کے ترجموں کی جانب توجہ دیں گے تو اس سے بہت بڑا فائدہ اردو ادب کو ہوگا اور پھر ماہر منصور نے اپنی زیادہ تر توجہ کنڑ ادب وشاعری کے ترجموں پر مرکوز کر دی اور 1963 کے بعد انھوں نے ہندوستان کے اہم ادبی رسالوں کے لیے کنڑ ادب کے ترجمے روانہ کیے اور وہ شائع بھی ہوتے رہے۔ ان کے ترجمہ کے کام کے لیے یہ پہلا ایوارڈ ہے اس سے قبل سنٹرل ساہتیہ اکادمی نے '' فرمودات'' کے لیے انھیں ایوارڈ دیا تھا۔ مجلس ادب نے ان کی شاعری کے لیے انھیں ایوارڈ دیا ہے۔ میسور دسہرہ کمیٹی میں بھی وہ دو مرتبہ اور کنڑ ساہتیہ پریشد عالمی کنڑ کانفرنس میں بھی اپنے ادبی کام کے لیے داد تحسین پا چکے ہیں۔ (سالار، بنگلور)

● دہلی۔ وگیان پریشد پریاگ، الہ آباد کی طرف سے 30 ستمبر، 2008 کو قومی اردو کونسل نئی دہلی کے آڈیٹوریم میں ایم. اے. قریشی کو بچوں کے سائنسی ادب کے لیے '' محمد خلیل بال وگیان پرسکار'' برائے 2007 سے نوازا گیا۔ یہ انعام پاپولر سائنس کے رسالے '' سائنس کی دنیا'' کے سابق ایڈیٹر محمد خلیل کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ اس میں ایک سال اردو میں اور ایک سال ہندی میں بچوں کے سائنسی ادب کے لیے انعام دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر علی جاوید، ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ہاتھوں سے یہ انعام ایم. اے. قریشی کو دیا گیا۔ انھیں انعامی دستاویز کے ساتھ ایک شال اور ایک ہزار روپے پیش کیا گیا۔

ڈاکٹر اشوک مشرا، صدر وگیان پریشد پریاگ، نے کہا کہ اردو اور ہندی دونوں اس ملک کی اہم زبانیں ہیں اس لیے بچوں کے لیے ان دونوں زبانوں میں سائنسی ادب کو فروغ دینا ضروری ہے۔ چوں کہ بچوں کے سائنسی ادب کے فروغ میں محمد خلیل کا کام بہت اہمیت کا حامل ہے، اسی لیے یہ انعام انھی کے نام سے وگیان پریشد پریاگ نے شروع کیا۔ محمد خلیل نے کہا کہ سائنس کو اردو میں مقبول عام کرنے کے لیے انھوں نے ہندوستان کے بڑے بڑے سائنس دانوں سے درخواست کر کے اردو میں سائنسی موضوعات پر مضامین لکھوائے اور '' سائنس کی دنیا'' میں شامل کیے تاکہ بچوں میں سائنس کا شوق پیدا ہو۔ مخمور سعیدی نے کہا کہ اردو میں سائنسی موضوعات پر لکھنے والے کم ہیں، خاص طور پر بچوں کے لیے۔ جو لوگ یہ اہم خدمت انجام دے رہے ہیں ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر علی جاوید نے اردو میں سائنٹفک لٹریچر کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اردو جاننے والے طبقے میں سائنسی مزاج کی بنیاد کی مضبوطی کے لیے تو جوان سائنس دانوں کو اردو میں سائنسی موضوعات پر زیادہ سے زیادہ لکھنا چاہیے۔ آخر میں ایم. اے. قریشی نے کہا کہ اردو میں سائنس پر لکھنے والوں کی جو کمی ہے، اس کے کئی اسباب ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بہت ہی کم اچھے سائنس داں اردو جانتے ہیں اور بہت ہی کم اچھی اردو جاننے والے اچھے سائنس داں ہیں۔ اس لیے اردو جاننے والے سائنس دانوں میں پاپولر سائنس لکھنے کے لیے بیداری پیدا کرنی ہوگی۔ ڈاکٹر ترویدی سکریٹری '' وگیان پریشد پریاگ'' نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

● کشن گنج، 30 نومبر، کشن گنج میں منعقدہ یک روزہ فروغ اردو کانفرنس میں سیمانچل کے مقبول ترین شاعر، صحافی اور آکاشوانی اناؤنسر ہارون رشید غافل کو شاعری کے میدان میں قابل ذکر کارکردگی کے لیے انجمن اسلامیہ کمیٹی کی جانب سے فروغ اردو ایوارڈ 2008 سے سرفراز کیا گیا۔ اس موقع پر معروف صحافی جمشید عادل کے ہاتھوں مومنٹو پیش کیا گیا جبکہ صدر اجلاس اور حکومت ہند کے وزیر مملکت محمد تسلیم الدین نے نیک تمناؤں کے ساتھ مسٹر غافل کو اعزازی سند دے کر حوصلہ افزائی کی۔ ناظم اجلاس پروفیسر منصور عالم نے تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہارون رشید غافل نے اردو علاقائی شاعری کو عوامی مقبولیت دلانے میں کافی جدو جہد کی ہے اور شہری آبادی کے علاوہ دیہی علاقوں میں مشاعروں، سیمیناروں اور اجلاسوں کے ذریعے نئی نسل کو بیدار کیا ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● گورکھپور۔ 30 نومبر، پوروانچل میں معتبر محقق اور گنگا جمنی تہذیب کے پیروکار پروفیسر احمر لاری، سابق صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی کو گذشتہ دنوں یونیورسٹی اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن اتر پردیش کی جانب سے طویل تدریسی خدمات کے پیش نظر لکھنؤ میں ایوارڈ پا چکے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر لاری کو ہدیۂ تبریک پیش کرنے کے لیے آج ڈاکٹر اشتیاق احمد خان کی رہائش گاہ میاں بازار پر ایک نشست کا اہتمام جناب پروفیسر (میجر) کے. کے. مشرا کی صدارت میں کیا گیا۔ میزبان ڈاکٹر خان نے پروفیسر لاری کی تدریسی، علمی اور تصنیفی خدمات کا تفصیلی تذکرہ کیا اور انھیں مبارک باد پیش کی۔ صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی ڈاکٹر رضی الرحمن نے اردو اساتذہ کو درپیش دشواریوں اور حکومت کی عدم توجہی کی جانب سامعین کو متوجہ کیا اور جناب لاری کو ہدیہ تبریک پیش کیا اور کہا کہ اس ایوارڈ سے گورکھپور کے عوام کو فخر محسوس ہونا چاہیے۔ نشست

میں اور لوگوں کے علاوہ حکیم محمد احمد، ڈاکٹر مشیر احمد، ڈاکٹر جاوید ملک، ڈاکٹر حسین لاری، زبیر احمد بیگ وغیرہ اہم شخصیتوں نے شرکت کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● سہارن پور۔ 26 نومبر، انجمن زندہ دلان سہارنپور کی جانب سے پروفیسر یوگیش چھمر آنند کو ان کی سماجی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں مولانا آزاد ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ آئی۔ اے۔ ہال میں منعقد اس تقریب کی شمع مہاراج سنگھ کالج منتظمہ کمیٹی کے سکریٹری چندر کانت اگروال نے روشن کی، انجمن کے صدر آصف شمسی اور سکریٹری عاصم پیرزادہ اور دیگر اراکین نے یوگیش چھمر کو تالیوں کے درمیان مالا، شال، یادگار سمبل اور سپاس نامہ پیش کیا۔ صدارت کر رہے پدم شری یوگی بھارت بھوشن نے یوگیش چھمر کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے تعلیم کے میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ قابل تعریف ہیں۔ مہاراج سنگھ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر کے. کے. شرما نے انھیں بہترین شاعر بتایا۔ جین کالج کے پرنسپل ڈاکٹر آر. آر. آزاد نے ''لائف اے کینڈل ان دی سٹی'' بتایا منا لال ڈگری کالج کی پرنسپل نلا نجنا کشور نے انھیں بہترین استاد کے ساتھ بہترین انسان قرار دیا۔ مختار علی خاں نے انھیں قومی اتحاد کا علمبردار بتایا۔ اسلامیہ انٹر کالج کے پرنسپل اختر علی خاں سمیر نے اپنی تقریر میں اعتراف کیا کہ انھیں مختلف زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ اس موقعے پر تقریر کرتے ہوئے یوگیش چھمر نے کہا کہ میں دہرہ دون کو الوداع کہہ کر 28 سال قبل سہارنپور آیا تھا اور پہلے 3 سالوں میں میں نے واپس جانے کی کوشش کی، مگر اس کے بعد مجھے پیچھے مڑنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ہیمنت اور ہیمانگ نے ان کے دوحے سشیل ناز نے ان کے لکھے بچے ابھیلاشا اور سنجیو جھینگرن نے ان کے گیت سنا کر محفل کو محظوظ کیا۔

(صحافت، دہلی)

● دیوبند۔ 10 نومبر، دیوبند میں یوم اردو کے موقعے پر ہندوستان ایکسپریس کے نمائندہ ذکی انجم کو بہترین صحافت کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ آزادی کے بعد اردو نے بہت نا مساعد حالات جھیلے مگر آج اردو کا مستقبل خوش آئند ہے۔ ان خیالات کا اظہار شاہد زبیری نے کیا جو اردو کے ایک روزنامے سے وابستہ ہیں۔ وہ آج یہاں اسلامیہ انٹر کالج میں منعقدہ ایک خصوصی تقریب میں اردو اساتذہ اور صحافیوں سے خطاب کر رہے تھے۔ یہ تقریب اردو ٹیچر ویلفیئر ایسوسی ایشن یونٹ دیوبند کے زیر اہتمام یوم اردو کے موقعے پر منعقد کی گئی تھی۔ شاہد زبیری نے آگے کہا کہ اردو کو مٹانے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی اور آج اردو والوں پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ اردو سے اپنے جذباتی رشتے کو اور مضبوط کریں۔ شاہد زبیری نے کہا کہ آج اردو روزی روٹی سے وابستہ زبانوں کی صف میں شامل ہو چکی ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے اور مزید مسرت کی بات یہ بھی ہے کہ آج اردو اخبارات کی تعداد بھی بڑھی ہے اور پڑھنے والوں کی تعداد بھی بڑھی ہے۔ دیوبند کے ادیب و ناقد حامد تحسین خاں نے کہا کہ دیوبند نے ہمیشہ اردو کی بے لوث خدمات انجام دی ہیں اور یہ روایت نئی نسل میں منتقل ہو چکی ہے اور دیوبند کے موجودہ شعرا اور لکھنے والے اردو کو زندگی اور دوام بخش رہے ہیں۔ اس موقعے پر اردو کے لیے خدمات کے اعتراف میں اردو صحافیوں اور اردو اساتذہ کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ صحافیوں میں ذکی انجم صدیقی کو بہترین صحافت کے لیے اعزازی سند دی گئی ان کے علاوہ دیگر صحافیوں عارف عثمانی، رضوان سلمانی، وسیم عثمانی کو بھی اعزازی سند دی گئی۔ پروگرام کی صدارت حامد تحسین خاں نے کی۔ نظامت کے فرائض کمل دیوبندی نے انجام دیے۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

مشاعرے

اس طرف کچھ لفظ ہوں گے اس طرف تفصیل ہوگی
بیچ میں پھیلی ہوئی خاموشیوں کی جھیل ہوگی

شاہد میر

● بھوپال۔ 15 اکتوبر، عیدملن کے عنوان سے بھوپال لٹریری سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک شعری نشست سوسائٹی کے سربراہ مولانا افضل کے مکان پر منعقد ہوئی جس کی صدارت مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے جوائنٹ سکریٹری اقبال مسعود نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض عارف علی عارف نے ادا کیے۔ اس موقع پر مولانا افضل کی جانب سے شعرا کا استقبال ہار پھول سے کیا گیا اور بطور اعزاز ایک ایک شال پیش کی گئی۔ معروف شاعر فاروق انجم کو ان کے شعری مجموعے کی اشاعت کے لیے پانچ ہزار کا ایک چیک بھی پیش کیا گیا۔

اقبال مسعود نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ وہ دور دوسرا تھا جب شخصی حکومتوں میں امرا علم وفن کی قدردانی میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ آج صاحب حیثیت لوگ بھی اپنے اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں اور شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی اور مالی معاونت کا فریضہ سرکاری تنظیموں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اکثر مستحقین ادبی سیاست کا شکار ہو کر اپنے حق سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ایسے ماحول میں مولانا افضل قابل مبارکباد ہیں کہ وہ اپنی گاڑھی کمائی سے اکثر شاعروں کی مالی اعانت بھی کرتے رہتے ہیں اور حوصلہ افزائی بھی۔

اس موقع پر شعرا کے علاوہ سامعین کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ نشست میں شریک شعرا تھے۔ اقبال مسعود، امتیاز انجم، شاہد میر، ضیا فاروقی، کامل

بہزادی، انجمن بارہ بنکوی، مولانا افضل، فاروق انجم، افسر صہبائی، بشر صہبائی، تاج الدین تاج، ڈاکٹر اکرام اکرم، عارف علی عارف، ادیب روشن، مسعود ناروی، مظفر طالب، وجے تیواری، اعظم بلیاوی، مہتاب عالم، اکبر مالوی، غلام دستگیر شرر، رئیس الحسن آتش، شریف انصاری، شرافت علی شرافت، کلیم دانش، گیان داس رائے نے عید پر ایک نظم پڑھی۔ (ندیم، بھوپال)

تمھاری راہ میں مٹی کے گھر نہیں آتے
اسی لیے تو تمھیں ہم نظر نہیں آتے

وسیم بریلوی

● امروہہ۔ 29 نومبر، مشاعرے ہماری روایت ہی نہیں تہذیبی سرمایہ بھی ہیں۔ ہمیں ماضی کے رشتوں کو مضبوط کرتے ہوئے مستقبل سے ملاتے ہیں۔ کل ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد اے کے انٹر کالج امروہہ میں کیا گیا۔ مشاعرے کے کنوینر محمد ناصر صدیقی، فہیم شاہنواز خرم پرویز، محمد اکرم، محمد طالب، ندیم جاوید، خالد صدیقی رہے اور مسند نشیں رہے۔ حاجی اقرار احمد انصاری، اسلوب حسین، ایوب صدیقی، محبوب حسین، آل نبی، نسیم خاں و اظہر علی۔ مشاعرے کا آغاز خالد جاوید مظفر نگری نے نعت پاک سے کیا۔ نظامت کے فرائض فاخر ادیب نجیب آبادی نے انجام دیے ان شعرا نے اپنے کلام سے نوازا۔ ندیم شاد دیوبندی، خورشید حیدر، وسیم بریلوی، ترنم کانپوری، سکندر حیات گڑبڑ، عائشہ ناز، شائستہ ثنا بہیڑی، ٹیپکل جگتیالی حیدرآبادی۔ کالج کے منتظم محمد ایوب صدیقی نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔ مشاعرہ دیر رات تک چلا جس میں ہزاروں کی تعداد میں سامعین موجود تھے۔ (صحافت، دہلی)

کیوں اٹھ رہی ہیں میری طرف سب کی انگلیاں
ہاتھوں میں کیا کسی کے یہاں آئینہ نہیں

تابش مہدی

● نئی دہلی۔ 12 نومبر، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز کے تعاون سے دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو میں دہلی کی سرگرم ادبی تنظیم بزم شہباز کا ماہانہ غیر طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔ مشاعرے کی صدارت نسیم عباسی امروہوی نے کی، جبکہ نظامت عمیر منظر نے کی۔ ڈاکٹر تابش مہدی نے صدر مشاعرہ نسیم عباسی کا تعارف کرایا۔ شعرائے کرام تھے: ابوالمجاہد زاہد، نسیم عباسی امروہوی، ابرار کرت پوری، ڈاکٹر تابش مہدی، سلمان شمسی ندوی، ارشد کمال، عبدالعزیز یاس چاند پوری، احمد علی برق اعظمی، حسنین سائر، شعیب مرزا، افق فریدی، عمیر منظر، ضمیر اعظمی، اختر اعظمی، حامد علی اختر، رضوان علیمی، ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی، عبدالحمید قلب اور عامر شریف عباسی نے اس موقع پر سید عتیق الرب کی جانب سے شرکا کی ضیافت بھی کی گئی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اب آنکھوں سے بغاوت کر رہے ہیں
ہمارے خواب ہجرت کر رہے ہیں

جاوید قمر

● نئی دہلی۔ 7 نومبر، گذشتہ روز آزاد اسٹڈی سرکل (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام اردو کے بزرگ و بے باک صحافی احمد مصطفیٰ صدیقی راہی کی 50 سالہ صحافی خدمات کے اعتراف میں اعزاز یہ تقریب اور مشاعرہ (بہ تعاون اردو اکادمی دہلی) غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں زیر صدارت جناب اقبال آزر (ڈی جی ایم اترا کھنڈ پاور کارپوریشن) منعقد کیا گیا محترم مودود صدیقی نے راہی صاحب کی خدمت میں ایک شیلڈ پیش کی اور سوسائٹی کے صدر محمد عتیق صدیقی نے صدر مشاعرہ نفیس احمد صدیقی اور پروفیسر مشکور احمد کی گلپوشی کی اور راہی کی شخصیت کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی صحافتی دنیا میں پہلے اردو ڈائجسٹ ''ہما'' کے اجرا کا سہرا بھی راہی کے سر ہے۔ تقریب کی ابتدائی نظامت کے دوران شہباز ندیم ضیائی نے راہی کی خدمت میں تہنیتی اشعار پیش کیے، شمع مشاعرہ محترم نفیس احمد صدیقی نے روشن کی، نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے، شریک شعرا تھے:

گلزار دہلوی، شاد فدائی، پی پی سریواستو رند، ساحل سحری، اقبال آزر، کمال جعفری، نواب تقی شیر کوٹی، شہباز ندیم ضیائی، شمس رمزی، ملک زادہ جاوید، انور باری، کشش وارثی، جاوید قمر، معین شاداب، جاوید مشیری، اقبال فردوسی، رؤف رامش۔ (ہمارا سماج، دہلی)

شاخ سے ٹوٹ بھی جاؤں تو شکایت نہ کروں
حکم یہ ہے کہ ہواؤں سے بغاوت نہ کروں

نصیر الحسن وفا

● علی گڑھ۔ 11 نومبر، شاعر مشرق علامہ اقبال کے یوم پیدائش کو پرچم پارٹی آف انڈیا نے ہر سال کی طرح امسال بھی یوم اردو کے طور پر منایا۔ اس تعلق سے ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت نواب نعمت اللہ خاں شیروانی نے کی جبکہ پرچم پارٹی آف انڈیا کے قومی صدر سلیم پیرزادہ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے محفل کو وقار بخشا۔ نظامت کے فرائض اویس جمال شمسی نے انجام دیے مشاعرے سے خطاب کرتے ہوئے سلیم پیرزادہ نے کہا کہ اردو ہندوستانیت کی پہچان ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری مشترکہ تہذیب کی زندہ تابندہ وراثت ہے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے اویس جمال شمسی نے شعرائے کرام سے اپیل کی کہ جس طرح ہمارے بزرگوں نے ملک کی آزادی کے لیے قلم کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اسی طرح آج پھر سے قلمکاروں کو اردو کو اس کا حق دلانے کے لیے متحد ہوکر میدان میں آنا ہوگا اور اپنے ملی تشخص کا تحفظ کرنا ہوگا مشاعرہ میں جن شعرا کو داد وتحسین سے

نواز اگیا ان کے اسمائے گرامی ہیں:

نعمت اللہ نعمت شیروانی، اعجاز پنڈراولی، عرفان جمالی، راشد الاسلام راشد، اویس جمال شمسی، مشرف حسین محضر، جاوید احسن فلاحی، اسلم خورشید، رضوان الرضا، بصیر الحسن وفا، ارشد کمال فغاں، مبشر قمر، کلیم ثمر بدایونی، سرور مارہروی، ڈاکٹر آفتاب عالم، شاکر علی اشہر، انجم عرفانی، تاج جمالی، جاوید اختر وارثی، امجد حسین ساحل، ظفر دارک قاسمی، یوسف ہاتف سمندری، شریف احمد شریف، محمد شریف خاں سامر اور مضطر جلسیری۔ آخر میں پرچم پارٹی آف انڈیا کے شہر صدر مسٹر انور عقیل نے شعرائے کرام اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(ہمارا سماج، دہلی)

دل کے ٹکڑوں میں بھی آتی ہے نظر شکل تیری
آئینہ ٹوٹ گیا عکس مگر باقی ہے

شمیم تیواری

● متھرا۔ 13 نومبر، بزم شیدائے ادب متھرا کے زیر اہتمام طرحی مشاعرہ اعظمی منزل منوہر پورہ متھرا میں منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کے سرپرست بابو یٰسین خاں شفائی تھے۔ صدارت برج شمیم متھراوی نے کی۔ شمع افروزی آگرہ کے شاعر مشکور کانپوری نے کی۔ جبکہ نظامت کے فرائض شاعر محمد اشفاق ثمر کوسوی نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی جی ایم بخشی اکبرآبادی تھے اور مہمان ذی وقار گلزار اکبرآبادی تھے۔ بانی بزم سعید اعظمی نے تمام حضرات کا گلپوشی کرکے استقبال کیا۔ مندرجہ ذیل شعرا نے کلام پڑھا:

بابو یٰسین خاں شفائی، شمیم متھراوی، سعید اعظمی، مشکور کانپوری، گلزار اکبرآبادی، محمد احمد خاں تابش، مشرف حسین محضر، شکیل تلہری، صوفی جمال کابری، حسرت صفی پوری، محمد اشفاق ثمر کوسوی، قاری فضل الرحمٰن انجم، شرافت علی پرواز، اسلام متھراوی، عبدالحکیم جالب، چھٹن خاں ساحل، مقصود اکبرآبادی، بشر صہبائی بھوپالی، ساہو تلہری، شرر حسن پوری، ضمیر ہاپوڑی، وسیم اعظمی، قیصر علی ایڈووکیٹ، محمد ندا فاطمہ، انس انصاری، حبیب انصاری اور ماسٹر شمیم الدین وغیرہ نے بھی اپنے اشعار پیش کیے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

● مالیرکوٹلہ۔ 24 نومبر، گذشتہ دنوں پنجابی ساہتیہ سبھا (رجسٹرڈ) مالیرکوٹلہ نے پاسداران اردو، پنجاب (رجسٹرڈ) اور کاروان مالیرکوٹلہ کے اشتراک سے ایک اردو پنجابی مشاعرے کا اہتمام کیا۔ جس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے پروفیسر عراق رضا زیدی نے فرمائی۔ بھاشاو بھاگ پنجاب پٹیالہ کے ڈپٹی ڈائرکٹر سردار ہرپال سنگھ سدھو صاحب نے مہمان خصوصی سردارنی بلبیر کور ڈائرکٹر بھاشاو بھاگ پنجاب کی نمائندگی کرتے ہوئے مختلف زبانوں کے باہمی اشتراک پر دلی مبارکباد پیش کی۔ اس محفل مشاعرہ میں مہمانان اعزازی ڈاکٹر ایس ترسیم (مدیر، سہ ماہی نظریہ) پروفیسر محمود عالم (سکریٹری، پنجاب اردو اکادمی) اور ڈاکٹر طارق کفایت نے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

اس موقعے پر تین مجموعہ ہائے غزلیات بھی ریلیز کیے گئے۔:

آئینے کا گھر: ڈاکٹر زینت اللہ جاوید

رقص شرر: ناز بھارتی

تعلقات کا برزخ: ڈاکٹر روبینہ شبنم

جن شعرائے کرام نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں: پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر محمود عالم، ڈاکٹر ایس ترسیم سردار کرتار سنگھ پنچھی، جناب رام لال پریمی، پروفیسر زینت اللہ جاوید، جناب انجم قادری، جناب ناز بھارتی، جناب ڈاکٹر اسلم حبیب، جناب رمضان سعید، ڈاکٹر روبینہ شبنم، جناب مہندر دیپ، سردار گردو سنگھ، جناب دلشاد زیدی، جناب اختر علی اختر، جناب شیخ افتخار حسین، ڈاکٹر آر کے مشرا، ڈاکٹر سلیم زبیری، جناب ثمر گل (سہارن پور) ڈاکٹر اسلم ثاقب، ڈاکٹر دھرم واتش، جناب عارف حلیم، اجمل خاں اجمل، ضمیر علی ضمیر۔ (ڈاک سے)

رسم اجرا

مخدوم شاعر نبض شناس

● حیدرآباد۔ 22 اکتوبر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں کل ''مخدوم شاعر نبض شناس'' کی رسم رونمائی ایک خصوصی تقریب کے دوران یونیورسٹی کی چانسلر ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت کے ڈپٹی ڈائرکٹر و انچارج ڈاکٹر شجاعت علی راشد کی زیرادارت شائع کی جانے والی 325 صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب میں مخدوم محی الدین کے فن اور شخصیت کے مختلف گوشوں پر ملک بھر کے نمائندہ اسکالرس کی نگارشات شامل ہیں۔ مذکورہ بالا کتاب میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے علاوہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان، پرووائس چانسلر پروفیسر کے آر اقبال احمد اور رجسٹرار ڈاکٹر پی پرکاش کے پیامات کے علاوہ یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر پروفیسر محمد شمیم جے راجپوری، پروفیسر مغنی تبسم، جناب مجتبیٰ حسین، پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر بیگ احساس وغیرہ کے پرمغز مضامین شامل ہیں۔ (ہمارا سماج، دہلی)

''اسرار و رموز''

● بنگلور۔ 9 نومبر، ایثار پبلشنگ ہاؤس ٹرسٹ بنگلور کے زیر اہتمام دارالسلام، میں علامہ اقبال کی کتاب ''اسرار و رموز'' کے منظوم اردو ترجمہ کی، جو

جناب سید احمد ایثار نے ''اسرار و رموز کے نام سے کیا ہے، پروفیسر م.ن.سعید کے ہاتھوں رسم اجرا انجام پائی۔ ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط ڈاکٹر راہی غدائی اور حیدرآباد کے جانے پہچانے شاعر رؤف خیر نے بحیثیت مہمانانِ خصوصی ''اسرار و رموز'' کے حوالے سے جناب سید احمد ایثار کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

ڈاکٹر یحییٰ نشیط نے فرمایا کہ تمکین کاظمی نے اقبال کی زندگی ہی میں ''اسرار خودی'' کا ترجمہ کیا تھا جسے اقبال نے رد کرتے ہوئے انھیں خط لکھا تھا کہ یہ ترجمہ نہ صرف ناقص ہے بلکہ غلط بھی ہے۔ نکلسن نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا تھا مگر ایک فارسی شعر کی غلط قرأت کی وجہ سے اقبال کے مفہوم کو نکلسن نے کچھ کا کچھ کردیا تھا۔ اسرار خودی کا منظوم اردو ترجمہ کئی لوگوں نے کیا جیسے نذیر احمد، جسٹس سلطان، عبدالرشید فاضل، عصمت جاوید وغیرہ ان مترجمین کے ترجموں کے ساتھ جناب ایثار کے ترجمے کا موازنہ کرتے ہوئے ڈاکٹر یحییٰ نشیط نے اسے ان سے بہتر بتایا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ترجمے کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اصل سے بہت قریب ہو۔ آپ نے جناب ایثار کو قابل مبارکباد قرار دیا کہ انھوں نے اقبال کے کلام کا ہو بہو ترجمہ کیا ہے اور ترجمانی بھی کی ہے۔ یہ ان کے دونوں زبانوں پر عبور کا ثبوت ہے۔ دو چار کوتاہیوں کو بحر بسیط میں دو چار قطروں کی مانند سمجھنا چاہیے۔ رؤف خیر نے اپنے مقالے میں جناب ایثار کے اقبال کے ترجموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ایثار صاحب نے ہر کتاب کا بھرپور مقدمہ بھی تحریر فرمایا جس سے کتاب، صاحب کتاب اور مترجم کی علیت سے قاری کا شرح صدر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر راہی فدائی نے کہا کہ اقبال حساس، رقیق القلب اور ہر معاملے میں خیر کے پہلو پر نظر رکھنے والے تھے اسی وجہ سے انھوں نے کھلے دل سے اپنے کلام میں رام، گرونانک، بھرتری ہری، وشوامتر وغیرہ کا ذکر کیا ہے اسی طرح جناب ایثار بھی نرم دل اور پیکر ایثار ہیں اسی وجہ سے ہر جگہ یکساں مقبول و ممتاز ہیں وہ دراصل فنافی الاقبال ہیں۔ بشری تقاضے کے طور پر کچھ کوتاہیاں بھی ان تراجم میں در آئی ہیں مگر ان کے یہ تراجم عاشق اقبال کے طور پر انھیں ادب میں زندہ رکھیں گے۔ سید احمد ایثار صاحب نے اپنے تراجم کے شوق کے بارے میں بعض دلچسپ انکشافات فرمائے۔ سب سے پہلے خیام نے آپ کو متاثر کیا اور پھر آپ نے خیام، سعدی، حافظ، مولانا رومی کے ساتھ ساتھ اقبال کے شاہ کاروں کا منظوم ترجمہ کر ڈالنے کا بیڑہ اٹھایا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اقبال کے کلام کے تراجم دنیا کی تیئیس زبانوں میں تا حال ہو چکے ہیں۔ انھوں نے صدر جلسہ پروفیسر م ن سعید، ڈاکٹر یحییٰ نشیط، ڈاکٹر راہی فدائی اور رؤف خیر کی گل پوشی اور شال پوشی بھی کی اور مقالات پر سب کا شکریہ بھی ادا کیا۔

صدر جلسہ محترم پروفیسر م ن سعید جنھوں نے ''اسرار و رموز'' کی رونمائی کی تھی، اسے اپنے لیے اعزاز فرمایا اور کہا کہ اقبال کی تمام فارسی کتابوں کا منظوم ترجمہ کرنے کی سعادت صرف ایثار صاحب کے حصے میں آئی ہے۔ پروفیسر م ن سعید نے کہا کہ ان تراجم میں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی متن پیش کر کے ایثار صاحب نے اپنے کام کو اور مستند بنادیا ہے۔ جلسے کی نظامت محمد اقبال نائب مدیر سالار نے خوش اسلوبی سے کی۔ (ڈاک سے)

''اکبر رضا جمشید، فن اور شخصیت''

● پٹنہ۔ 9 نومبر علمی مجلس بہار کے زیر اہتمام 8 نومبر کو بہار اردو اکیڈمی کے سیمینار ہال میں پرویز عالم کی مرتب کردہ کتاب ''اکبر رضا جمشید فن اور شخصیت'' کی رسم اجرا انجام پائی جلسے کی صدارت سابق جج پٹنہ ہائی کورٹ ولوک آیوکت سید سرور علی نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پٹنہ ہائی کورٹ کے جسٹس سید شاہ نیر حسین تشریف فرما تھے۔ پروگرام کا آغاز مسلم رضا کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ پرویز عالم نے مہمانوں کا استقبال کیا اور کہا کہ ہم آج ایک بڑے فنکار کے اوپر کتاب مرتب کر کے ان کا استقبال بھی کر رہے ہیں۔

سید شاہ نیر حسین کے ہاتھوں کتاب کی رسم اجرا انجام پائی۔ سامعین سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جمشید بھائی کو بچپن سے جانتا ہوں۔ میں انھیں جمشید صاحب نہیں بھائی کہتا ہوں۔ خوشی کی بات ہے کہ جمشید بھائی پر اچھی کتاب مرتب کی گئی ہے جو ان کے فن اور شخصیت کا احاطہ کرتی ہے۔ صدارتی خطبے میں سید سرور علی نے کہا کہ اکبر رضا جمشید نے ادب میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور اپنی تحریروں سے ادب میں ایک ڈرامائی رنگ پیدا کیا ہے۔ صدر نے اردو کے گوناگوں مسائل کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو روز بروز ختم ہوتی جارہی ہے جو باعث فکر ہے اردو کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ نئی نسل کو اردو پڑھائی جائے۔ اس موقعے پر اسمٰعیل حسن نقوی نے بھی کتاب سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ عطا عابدی کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں جنرل سکریٹری پرویز عالم کے شکریے کے بعد محفل کا اختتام ہوا۔ (قومی تنظیم، پٹنہ)

''سیاہ رات''

● ناگپور۔ اردو کے مشہور افسانہ نویس اور ناول نگار جناب وکیل نجیب کی اکیسویں تصنیف ناول ''سیاہ رات'' کا اجرا جج ترینی سینٹر ناگپور کے وسیع و عریض ہال میں ہوا جس کی صدارت یونس انیس انصاری صاحب نے کی اور اجرا بھی موصوف کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے ناول کا بھرپور تجزیہ کیا اور وکیل نجیب صاحب کے رواں دواں بیانیے کی تعریف کی۔

ڈاکٹر اظہر حیات نے وکیل نجیب کی منجملہ تصنیفات کا حوالہ دیتے ہوئے ''سیاہ رات'' پر تفصیلی بحث کی جناب محمد غلام رسول اشرف نے وکیل نجیب کی ادب اطفال کے تئیں خدمات کا اعتراف کیا اور شمیم اختر بھادا نے وکیل نجیب کی مختلف حیثیتوں سے کارکردگی پر تفصیلی معلومات فراہم کی۔ مہمان خصوصی شری دواکر راؤ پٹنے (نائب صدر ناگپور ضلعی کمیٹی شیوسینا) نے کہا کہ ملک میں آتنک واد کے متعلق ناول لکھ کر وکیل نجیب صاحب نے زبردست کام کیا ہے میں کوشش کروں گا کہ اس ناول کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہو۔ امیر اللہ عنبر خلیقی صاحب نے وکیل نجیب کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ جناب یونس انیس انصاری نے وکیل نجیب کے ادبی کاموں کو ناگپور کے لیے سرمایۂ افتخار بتایا اور اپنی تقریر میں جگہ جگہ وکیل نجیب کے ناولوں کا حوالہ دیا۔

شہر کی مختلف ادبی و سماجی تنظیموں کی جانب سے وکیل نجیب صاحب کا استقبال کیا گیا شال، میمنٹو اور دیگر تحائف پیش کیے گئے۔ (ڈاک سے)

''شاخ گل''

● نئی دہلی۔ 30 نومبر، آج شام غالب اکیڈمی میں ممتاز شاعر مخمور سعیدی کی صدارت میں شیخ محمد ذوالقدر خمار سہارنپوری کے شعری مجموعے ''شاخ گل'' کی رسم اجرا خواجہ حسن ثانی نظامی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ رسم اجرا سے قبل صاحب کتاب کے اہل خانہ نے خواجہ حسن ثانی، مخمور سعیدی، شاہد زبیری، اختر علی خاں سمیر اور نصرت ظہیر کو گلدستے پیش کیے۔ کتاب کا اجرا کرتے ہوئے خواجہ حسن ثانی نظامی نے کتاب اور صاحب کتاب کے حوالے سے مختصر گفتگو کی۔ نصرت ظہیر نے خاکہ پڑھا اور اختر علی خاں سمیر نے مضمون۔ متین امروہوی، وقار مانوی اور کچھ دیگر شعرا نے تہنیتی قطعات سنائے۔ صاحب صدر مخمور سعیدی کی تقریر کے بعد جنھوں نے خمار سہارنپوری کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی، ایک مختصر شعری نشست بھی مخمور سعیدی کی صدارت میں ہوئی جس میں لاہور سے آئے ہوئے مشہور شاعر صابر آفاقی کے علاوہ دہلی اور سہارنپور کے کئی شعرا نے جو بہ طور خاص اسی تقریب میں شرکت کرنے آئے تھے، اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ خمار صاحب کو دوبارہ کلام سنانے کی زحمت دی گئی۔ (ڈاک سے)

''پیر کارواں''

● ناگپور۔ پروفیسر سید رفیع الدین سابق صدر شعبۂ اردو، فارسی و عربی ناگپور یونیورسٹی نے یہاں ایک تقریب میں ڈاکٹر محمد یٰسین قدوسی کی کتاب پیر کارواں کا اجرا فرمایا۔ یہ کتاب کامٹی ناگپور کی ایک شخصیت پیر محمد، آرمی کنٹریکٹر کی زندگی اور ان کے دور سے متعلق ہے۔ پیر محمد ٹھیکیدار نے 1947 سے قبل یعنی انگریزوں کے دور میں سماجی اور ثقافتی زندگی میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ 1955 میں عدن بندرگاہ کے قریب سفر حج کے دوران ان کا انتقال ہوا۔ اسی تقریب میں پروفیسر سید رفیع الدین نے ڈاکٹر محمد یٰسین قدوسی کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ کتاب میں خانوادۂ پیر محمد کی تفصیلات اور ان کے کارناموں کے ساتھ ساتھ اس دور کی علمی، ادبی، سماجی شخصیات کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور ان کے حالات بیان کیے گئے ہیں جو اس علاقے کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس موقعہ پر ڈاکٹر محمد یٰسین قدوسی نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض محمد نثار اختر انصاری نے انجام دیے۔ حاضرین میں ڈاکٹر حبیب الحسن قادری، ڈاکٹر محتشم، رضوان قدوسی، نشاط احمد قدوسی، ظفر جاوید، ندیم بھائی، شعیب پرویز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ (ڈاک سے)

''دریچے یادوں کے''

● دیوبند۔ 22 نومبر، ہارون حسرت دیوبندی کے شعری مجموعے ''دریچے یادوں کے'' اجرا کے موقعے پر دہلی سے تشریف لائے معروف شاعر گلزار دہلوی نے کہا کہ سرزمین دیوبند علم و ادب کے میدان میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ ہارون حسرت دیوبندی کا شعری مجموعہ اس صف میں ایک نئے باب کا آغاز ہے۔ موجودہ دور میں ہارون حسرت دیوبندی یہاں کے نمائندہ شاعر ہیں۔ پروگرام کا آغاز محمد طالب کی تلاوت کلام پاک اور طارق نیر کی نعت پاک سے ہوا۔ پروگرام کنوینر، طارق انصاری، محمد عارف انصاری اور غفران صادق نے گلزار زتشی کا استقبال کیا۔ ہارون حسرت دیوبندی نے اپنے استاد محترم شمیم اسنی اکبرآبادی کو شال پیش کی تقریب میں نگر پالیکا کے سابق چیئرمین انعام قریشی، ابوالکلام کلیم، قاصر سہوانی نے بھی ہارون حسرت کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی، پروفیسر حامد تحسین نے دیوبند کی ادبی سرگرمیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج کے دن اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ تقریب اجرا کی صدارت شمیم احمد شمیم دیوبندی نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر نواز دیوبندی نے انجام دیے۔

(ہمارا سماج، دہلی)

وفیات

رفعت سروش

● اردو کے ممتاز شاعر اور ادیب رفعت سروش کا 30 نومبر، 2008 کو سہ پہر ساڑھے تین بجے حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ انتقال سے چار دن پہلے انھیں نوئیڈا کے میٹرو اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ وہ 84

برس کے تھے۔ پس ماندگان میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان کی بیگم کا چند سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ بیگم کی دائمی جدائی کے بعد ان پر ایک مستقل اداسی چھا گئی تھی مگر اس اداسی نے انھیں تخلیقی طور پر اور فعال کر دیا تھا اور ان کی تحریری اور تصنیفی سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں۔ ان کی تدفین انتقال کے دوسرے دن صبح 10:00 بجے سینکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں قبرستان پنج پیران نزد بستی حضرت نظام الدین میں ہوئی۔

رفعت سروش کا اصلی نام شوکت علی تھا۔ وہ 08 اپریل، 1924 کو نگینہ، ضلع بجنور، کے ایک سید خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنی زندگی کے تقریباً چالیس سال انھوں نے آل انڈیا ریڈیو میں ایک سرگرم براڈ کاسٹر کی حیثیت سے ممبئی اور دلی میں گزارے۔ ریڈیو کی ملازمت سے سبک دوشی کے بعد وہ کچھ مدت تک غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے ڈائرکٹر بھی رہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا سارا وقت ادبی مشاغل میں گزارا۔ وہ نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے اور دونوں اصناف میں انھوں نے 87 کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ انھوں نے ایک طرف اگر غزل، پابند نظم، آزاد نظم اور اوپیرا جیسی اصناف سخن میں قادر الکلامی کے جوہر دکھائے تو دوسری طرف نثر میں ناول، افسانے اور تنقیدی اور تحقیقی مضامین بھی لکھے لیکن ان کی پہلی پہچان شاعری ہی تھی۔

رفعت سروش کو ان کے ادبی کاموں کے صلے میں متعدد انعامات و اعزازات حاصل ہوئے اور ان کی خدمات کے اعتراف میں رسالوں کے نمبر اور ان کے فکر و فن پر کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ رفعت سروش نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت بھی اعلیٰ پیمانے پر کی تھی۔ ان کی بڑی بیٹی شبانہ نذیر جو شاعرہ بھی ہیں، ایک کالج کی پرنسپل ہیں، دوسری بیٹی شاہینہ خان آل انڈیا ریڈیو میں پروڈیوسر ہیں۔ ایک بیٹے جاوید سروش آرکیٹیکٹ ہیں اور دوسرے بیٹے نوید سروش افغانستان میں برسرکار ہیں۔

عادل منصوری

● ممبئی۔ 13 نومبر، اردو کے ممتاز جدید شاعر عادل منصوری کا پچھلے دنوں امریکہ کے شہر نیو جرسی کے ایک اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ عادل منصوری کی عمر 74 سال تھی۔ اسپتال میں 06 نومبر، کو انھوں نے آخری سانس لی۔ نیو جرسی کے ٹی نیک علاقے میں مسجد دار الاصلاح میں اگلے روز ان کی تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوی کے علاوہ ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔ عادل منصوری احمد آباد کے رہنے والے تھے۔ برسوں پہلے وہ نیو جرسی میں منتقل ہو گئے تھے اور ان کو امریکی شہریت بھی مل گئی تھی۔ انھیں حال ہی میں حکومت گجرات نے ''ولی گجراتی ایوارڈ'' دیا تھا جسے لینے وہ ہندوستان آئے تھے۔

عادل منصوری 1960 کے بعد سامنے آنے والے شعرا میں اپنی ایک امتیازی پہچان رکھتے تھے۔ انھوں نے نظم اور غزل دونوں میں زبان و بیان کے جو جرأت مندانہ تجربے کیے اس میں ان کا کوئی ہم عصر ان کا شریک نہیں تھا۔ ان دنوں وہ اپنا کلیات مرتب کر رہے تھے اور ان کا جو پرانا کلام ان کے پاس محفوظ نہیں رہا تھا، اس کی تلاش میں اپنے قیامِ ہندوستان کے دوران دلی بھی آئے تھے جہاں سے نکلنے والے مرحوم رسالے ''تحریک'' میں تواتر کے ساتھ ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہی تھیں۔ ''تحریک'' کی فائل دلی اردو اکادمی کی دارا شکوہ لائبریری میں محفوظ ہے اور لائبریری انچارج محترمہ نزہت مہدی اور ''ایوانِ اردو'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر انچارج راغب الدین صاحب نے وہ تمام چیزیں انھیں فراہم کرا دی تھیں۔

ڈاکٹر سید صفی اللہ

● چینئی، 12 اکتوبر، 2008 کی صبح ڈاکٹر سید صفی اللہ عرف عابد صفی، سابق وائس چیئرمین، تمل ناڈو اسٹیٹ اردو اکادمی، اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ مرحوم یونیورسٹی آف مدارس کے شعبۂ اردو کے لکچرار رہ چکے تھے اور اسی شعبہ کے صدر کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے تھے۔ وہ ایک اچھے محقق اور افسانہ نگار تھے۔ حال ہی میں ان کی تصنیف ''تمل ناڈو کے اردو نثر نگار'' اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہے۔

جوگا سنگھ انور

● جمشید پور، 17 نومبر، 2008، شہر آہن کے مشہور و معروف شاعر سردار جوگا سنگھ انور کا انتقال 11 نومبر کو جمشید پور میں ہو گیا جس کی اطلاع شام کو اس وقت ملی جب مولانا آزاد سے متعلق یہاں ایک سیمینار چل رہا تھا۔ اس خبر سے تمام شرکا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ جوگا سنگھ انور تقریبات میں شامل ہوتے تھے ایک مشہور و مقبول شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت نیک دل انسان تھے، انھوں نے ٹاٹا اسٹیل کمپنی میں والی بال کے کوچ کی حیثیت سے قومی والی بال ٹیم کی بین الاقوامی حیثیت میں نمائندگی کی۔

جوگا سنگھ انور مشاعروں کے مقبول ترین شعرا میں تھے۔ ہندوستان بھر کے مشاعروں کے علاوہ وہ بیرونِ ملک خصوصاً خلیجی ریاستوں کے مشاعروں میں بھی پسند کیے جاتے تھے۔ ان کے کلام میں حالاتِ حاضرہ کی عکاسی کے ساتھ ساتھ انسانی قدروں کی ترجمانی مؤثر انداز میں ہوتی تھی۔ ان کے مجموعۂ کلام ''اگنی کنڈ'' کی ادبی حلقوں میں اچھی پذیرائی ہوئی تھی۔

بیگم شمیمہ بانو

● نئی دہلی۔ 7دسمبر، اردو اکادمی دہلی کے شعبۂ نشر و اشاعت کے انچارج اور نامور ڈرامہ نویس انیس اعظمی کی والدہ شمیمہ بانو صاحبہ کا آج انتقال ہوگیا۔ مرحومہ شمیمہ بانو صاحبہ 77 سال کی تھیں اور تقریباً دو سال سے انھیں کڈنی کا عارضہ لاحق تھا۔ آج صبح انھیں ہارٹ اٹیک ہوا اور چند سیکنڈوں میں روح پرواز کرگئی۔ پسماندگان میں چار بیٹے ہیں، جن میں سب سے بڑے انیس اعظمی ہیں۔ مرحومہ کے شوہر ابوشعیب احسن کا سال رواں کے ماہ جون میں انتقال ہو چکا ہے۔ اوکھلا میں بٹلا ہاؤس کے قبرستان میں آج بعد نماز عصر نماز جنازہ اور ان کی تدفین عمل میں آئی۔ مرحومہ شمیمہ بانو علمی اور ادبی خاندان سے تھیں۔ یو.پی. کے مردم خیز علاقے اعظم گڑھ کے جیراجپور سے ان کا تعلق تھا۔ مولانا اسلم جیراجپوری ان کے چچا اور مولانا عبدالسلام ندوی مرحومہ کے دادا تھے۔ علمی خاندان میں انھوں نے آنکھیں کھولیں، جس کا اثر ان کی پوری زندگی پر رہا۔ پرہیزگاری کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت پر انھوں نے پورا دھیان دیا، جس کی وجہ سے آج ان کے چاروں صاحبزادے، انیس اعظمی، جلیس اعظمی اور تنویر اعظمی اہم عہدوں پر کام کر رہے ہیں۔

زینت آپا (زینت ساجدہ)

●ایک دن سجاد شاہد کا فون آیا 'اماں بیمار ہیں انھیں مہاویر ہاسپٹل میں داخل کیا گیا ہے'۔ میں چونک پڑی، میں نے پہلے کبھی زینت آپا کو بیمار ہوتے نہیں سنا تھا۔ ہمیشہ چاق و چوبند رہنے والی میری آپا بیمار کیسے ہوگئیں؟ میں پریشان ہوگئی، دل دھڑ کنے لگا۔ روز ان کے گھر فون کرتی اور خیریت معلوم کرتی رہی۔ چند دن بعد فون آیا۔ شگفتہ نے آپا کے سانحۂ ارتحال کی جان لیوا خبر سنائی۔

بے ساختہ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے زینت آپا سے ملاقات wom-collge میں 1951 میں ہوئی اور پھر اردو ہال میں بھی ملنے کا سلسلہ جاری رہا۔ میں 1970 میں somaji G رہنے لگی اور اکثر آپا کو اردو ہال سے ان کے گھر واپس لے جاتی۔ راستے میں باتیں ہوتیں۔ ان کی زبان کی شیرینی اور اپنائیت نے میرا دل موہ لیا۔ موہنی صورت سوہنی سیرت، اب کوئی دوسری زینت آپا ہو نہیں سکتی، ایک طلسماتی شخصیت تھی she was an institution herself۔ وہ خود ایک انجمن تھیں۔ انسان دوستی اور ہمدردی ان کی فطرت۔ جس نے بھی ان سے تعلیم حاصل کی وہ نہ صرف دولت علم سے مامور ہوتا بلکہ ان کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوتا کہ بار بار ان سے ملنے کا خواہشمند ہوتا۔ آپا کے لیے دل میں خلوص اور احترام automatically پیدا ہوجاتا۔

میں اکثر آپا سے ملنے جاتی اور جب بھی گئی ہوں کچھ نہ کچھ سیکھ لے کر لوٹی ہوں۔ ان کے پاس وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر وہ بول نہیں سکتی تھیں۔ حیدرآبادی تہذیب، موسیقی، آرٹ، craft، پکوان، پوشاک، ہر بات سلجھی ہوئی۔ بعض فقرے ایسے ہوتے کہ بے ساختہ ہنسی آجاتی۔ زینت آپا کا Sense of Humour غضب کا تھا۔ ان کا ایک مخصوص انداز تھا جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ کاش میں نے ان کے ساتھ اور وقت بتایا ہوتا، ویسی شفقت ویسا پیار اب کہاں ملے گا؟

وہ نہ صرف اردو کی مایہ ناز استاد تھیں بلکہ وہ اردو روایات کا خزانہ تھیں۔ ان کا انتقال ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ میں خدا سے دعا کرتی ہوں کہ ان کے پسماندگان کو صبر عطا کرے۔

(لکشمی دیوی راج)

□□□

انیس کے سلام

مرتب: علی جواد زیدی

غزل کے تشکیلی مزاج میں عشق، اور سلام کو اعتقاد کے طور پر انفرادیت حاصل ہے۔ یہ وہ اعتقاد ہے جس میں اخلاق، منقبتی، رثائی، مدحیہ اور بھکتی جیسے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور کے سلام پر اعتقاد کی ہی فضا چھائی ہوئی تھی لیکن یہی صنف جب انیس تک پہنچی تو اس میں ایک جدید ادبی لب و لہجہ قائم ہوا۔ انیس نے سلام میں رثائی موضوعات کے علاوہ ذاتی مسائل، زمانے کی ناقدری، معاصرانہ چشمک اور بلند خیالی جیسے مضامین کو جگہ دی۔

''انیس کے سلام'' مرتبہ علی جواد زیدی میں انیس کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سلام شامل ہیں جس میں سلاموں کی تعداد 102 ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/60 روپے

تبصرہ وتعارف

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین
مترجم: ایم. ابوبکر
صفحات: 307، قیمت: -/96 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-66
مبصر: سعید النساء، J-3/141B، کرشنا کنج، ایکسٹنشن، نزد اٹاروالی مسجد، دہلی

خواجہ غلام السیدین اپنے زمانے کے مشہور ماہرین تعلیم میں تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم تک کے مراحل پر بہت کچھ سوچا اور سپرد قلم کیا ہے۔ اس موضوع پر ان کی دو کتابیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک زیر نظر کتاب اور دوسری ''مستقبل کا مدرسہ'' جو اس سے پہلے شائع ہوئی تھی۔ ''مستقبل کا مدرسہ'' کا پہلا حصہ ہمارے اسکولوں میں تعلیم جدید کے اصولوں کے انطباق پر تھا۔ اس میں مصنف نے بتایا تھا کہ اسکول کے ماحول کو کس طرح بہتر بنایا جائے کہ بچوں کی ذہنی نشو ونما ان کی انفرادی خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کی جاسکے اور ان کی فطری صلاحیتیں آزادانہ طور پر ترقی کرسکیں اور ان میں خود اعتمادی کا جذبہ پرورش پاسکے۔ دوسرے حصے میں اعلیٰ تعلیم کے بعض پہلوؤں سے بحث کی گئی تھی جس میں معلمین کی تربیت کے بعض پہلو بھی شامل تھے۔ پہلے حصے کی اہمیت کے پیش نظر سیدین صاحب نے ضروری نظرثانی کے بعد اسے اس کتاب میں بھی شامل کرلیا ہے۔

کتاب ایک ضمیمے (سماجی تربیت کا ایک تجربہ) کے علاوہ اکیس ابواب پر مشتمل ہے اور ان میں سے ہر باب ایک اہم موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ پہلے تین ابواب میں اسکول میں تعلیم وتدریس کا معیاری ماحول پیدا کرنے اور اسے بہرصورت قائم رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ ایک اچھے اسکول کی جو خصوصیات ہونی چاہئیں، ان کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ اگلے دو ابواب کا عنوان ''تعلیم برائے مسرت'' ہے۔ ان میں بڑی وضاحت وصراحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ تدریس کے عمل کو کس طرح خوشگوار اور طلبہ کے لیے پرکشش بنایا جاسکتا ہے۔ ساتویں باب میں اس وسیع النظری کی اہمیت دکھائی گئی ہے جو ایک استاد میں ہونی چاہیے۔ اپنے موضوع پر کتاب کی جامعیت کا کچھ اندازہ ابواب کے عنوانات پر ایک نظر ڈال کر ہی ہوجاتا ہے۔ مذکورہ بالا سات ابواب کے علاوہ باقی ابواب کے عنوانات اس طرح ہیں: گاؤں میں تعلیم کا رول، بیسک تعلیم کی دین، ثانوی تعلیم، ثانوی تعلیم کی تشکیل جدید، قومی زندگی میں سماجی تعلیم کا مقام، تعلیم بالغاں جمہوری شہریت کے لیے، عمدہ شہریت کی تعلیم، تعلیمی نظم ونسق کی بنیاد انسانیت آموزی، پیشے کا انتخاب، سماج میں معلم کی حیثیت، معلمین کی تعلیم وتربیت کا ایک نیا نظریہ، معلمین کی ٹریننگ کے بعض مسائل، تعلیمی نشاۃ الثانیہ اور معلم کا فرض، معلم اور اس کی دنیا۔

سیدین صاحب کا احساس تھا کہ اسکول مجموعی سماجی ماحول کا ایک حصہ ہے اور بچے کی انفرادیت اور اس کی فطری صلاحیتوں کا ارتقا محض اسکول کی چار دیواری میں نہیں پورے سماجی ڈھانچے کے زیر اثر ہوتا ہے۔ اس لیے تعلیمی عمل میں سیاست، اقتصادیات، مروج سماجی نظریات، سائنس اور جدید ترقیات سبھی کا دخل رہتا ہے اس لیے معلم کو چاہیے کہ وہ خود بھی ان تمام چیزوں سے باخبر رہے اور طلبہ کو بھی ان کے حسب استعداد ان سے باخبر رکھے۔ اصلاً یہ کتاب معلمین ہی کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ پہلے حصے میں ان اصولوں سے بحث کی گئی ہے جن کی روشنی میں تعلیم کے قومی نصب العین اور ترقی پسندانہ تعلیمی افکار کو سمجھا جاسکتا ہے اور دوسرے حصے میں، پرائمری تعلیم، دیہی بیسک تعلیم، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ انھوں نے معلموں کے لیے لازم قرار دیا ہے کہ وہ اپنے کام کے فطری تقاضوں سے گہری آگاہی بہم پہنچائیں اور اپنے اندر کام کی لگن پیدا کریں تاکہ ان ذمے داریوں سے جو ان کا منصب ان پر عائد کرتا ہے، بہ طریق احسن عہدہ برآ ہوسکیں۔

کتاب کے تیسرے حصے کو معلموں کی تربیت وتعلیم کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے جس میں ان کی فنی اور پیشہ ورانہ تربیت وتعلیم ہی نہیں، بلکہ ذہنی اور دماغی تربیت، شخصیت اور طرز عمل اور معاشرے سے ان کے ربط وتعلق پر بھی خیال انگیز گفتگو کی گئی ہے۔ سیدین صاحب نے بجا طور پر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اگر اساتذہ کی عام تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت معیاری اور اطمینان بخش ہو تو وہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیں گے اور نئی نسلوں کی ذہنی اور جسمانی پرورش و پرداخت صحیح خطوط پر ہوسکے گی۔

ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری

مصنف: گوپی چند نارنگ
صفحات: 600، قیمت: -/300 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-66
مبصر: ڈاکٹر ظہیر رحمتی، ذاکر حسین کالج (ایوننگ) جواہر لعل نہرو مارگ، نئی دہلی

زیر نظر کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں سے ہر حصہ بقول مصنف

ایک پوری کتاب ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ ''جغرافیائی اور معاشرتی قالب'' کے عنوان سے ہے۔ یہ حصہ دو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب بہ عنوان ''فطری آثار و مناظر'' میں مصنف نے محمد قلی قطب شاہ سے لے کر جدید شعرا کی تخلیقات کی مثالوں سے ہندوستانی موسموں، پہاڑی مناظر، دریا، چرند پرند، پھل نباتات، پھول، باغات و مقامات کو بیان کیا ہے۔ ان تمام امور کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بقول مصنف کسی زبان کا ادب خواہ کتنا ہی آفاقی و کائناتی کیوں نہ ہو اپنا رنگ و آہنگ کسی نہ کسی مخصوص ماحول اور معاشرت سے حاصل کرتا ہے۔ اردو کا تعلق ہندوستان کے ماحول اور یہاں کی زندگی سے گہرا ہے۔ لیکن مصنف کی اس رائے میں کلام ہے کہ ''اردو شاعری میں مقامی مناظر کی منظر کشی نسبتاً ایک جدید رجحان ہے۔ درحقیقت اردو کی ابتدائی شاعری کا معتد بہ حصہ مقامیت کے رنگ و آہنگ سے متصف ہے۔ غیر ملکی عناصر کی شمولیت تو بعد کی بات ہے۔ البتہ شمالی ہند کی شاعری کے تناظر میں یہ رائے صائب ہے۔

باب دوم بہ عنوان ''مشترکہ ہندوستانی معاشرت'' میں مصنف نے ہندوستانی تیوہار، تقریبات، میلے ٹھیلے، مشاغل، رسم و رواج، خاطر مدارات، لباس و زیورات، لوازمات حسن وغیرہ کو قدیم و جدید اردو شاعری کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ اصل موضوع کو ابھارنے میں خاطر خواہ طور پر معاون ہے لیکن اس حصے کو ایک مکمل کتاب قرار دینا محل نظر ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر باب میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنھیں بیان نہیں کیا گیا ہے۔

کتاب کا حصۂ دوم ''وطنیت، سامراج دشمنی اور جدوجہد آزادی'' کے عنوان سے ہے۔ یہ حصہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس حصے کے پہلے باب اور کتاب کے تیسرے باب بہ عنوان ''اردو شاعری میں حب وطن کی روایت'' میں مصنف نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ اردو شاعری میں ابتدا ہی سے قومی تقاضوں کا احساس پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اس شبہ کا ازالہ کیا ہے کہ اردو شاعری میں غیر ملکی عناصر یعنی فارسی کا تتبع اردو زبان کی وطن دوستی کو سطحی بناتا ہے۔ بقول مصنف اردو کا بنیادی ڈھانچہ ہندوستانی ہے۔ بیرونی علامات و علائم وغیرہ کی حیثیت رسمی اور روایتی سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن قدیم کلاسیکل شاعری کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہاں حب وطن کا تصور اس تصور سے بالکل مختلف ہے جو آج ہمارے پیش نظر ہے۔ بہتر ہوتا کہ اس باب میں حب وطن کے قدیم و جدید تصور پر مختصر طور پر روشنی ڈالی جاتی۔

چوتھے باب بہ عنوان ''1857 اور اردو شاعری'' میں مصنف نے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ پہلی جنگ آزادی کی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کی حکومت دین اور مذہب کے لیے خطرہ سمجھی جانے لگی تھی، اس لیے بقول مصنف اردو شاعروں نے حب وطن کے جن جذبات کا اظہار کیا ہے ان کا صحیح تجزیہ کرنے کے لیے ان تاریخی قوتوں کو نظر میں رکھنا ضروری ہے جو اس وقت کارفرما تھیں۔ اس باب میں مصنف نے مختصر طور پر تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو شعرا و ادبا کی قربانیوں کا ذکر کیا ہے۔

پانچویں باب بہ عنوان ''بعد کی شاعری حالی، شبلی، آزاد'' میں مصنف نے غدر کے بعد کی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے سرسید تحریک اور ان کے رفقا کی مساعی جمیلہ کو بیان کیا ہے، ساتھ ہی سرسید اور حالی و شبلی کے نظریاتی اختلافات کو بھی بیان کیا ہے۔ اس باب میں مصنف نے درگا سہائے سرور، اقبال، چکبست وغیرہ کے حوالے سے وطنیت کے احساس کی نشاندہی کرتے ہوئے بیسویں صدی کے آغاز میں اردو شاعری پر قومی اور سیاسی تحریکوں کے گہرے اثر کو واضح کیا ہے۔

چھٹے باب ''پہلی جنگ عظیم کے زمانے کی شاعری'' میں مصنف نے ظفر علی خاں، تلوک چند محروم، اکبر، حسرت موہانی اور اقبال وغیرہ شعرا کے یہاں ہندوستان کی مکمل آزادی کے حصول کے تصور کو بیان کیا ہے۔ اکبر کے سلسلے میں مصنف کی رائے ہے کہ اکبر کی شاعری نقاد کو اکثر دھوکا دیتی ہے۔ وہ نہ انگریز کے ساتھ تھے اور نہ تحریک آزادی کے۔ مصنف نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ چکبست لکھنوی کی شاعری جذبۂ حب وطن سے مملو اصلی شاعری ہے۔ بقیہ شعرا کے یہاں ایک خاص قوم کے تصور کے ساتھ جذبۂ حب وطن اور آزادی کا تصور ہے۔

ساتویں باب ''ترقی پسند اور قوم پرست شعرا'' میں مصنف نے ترقی پسند تحریک کا جائزہ لیتے ہوئے یہ خیال بہ عنوان قائم کیا ہے کہ اردو ادب نے اس زمانے میں آتش شوق کو تیز سے تیز تر کرنے میں وقت کا ساتھ دیا اور تحریک آزادی کو پوری قوت بخشی۔

کتاب کا حصہ سوم ''مطالعات خصوصی'' کے عنوان سے ہے جس میں مندرجۂ ذیل چھے مضامین شامل ہیں:

(i) غالب کا جذبۂ حب الوطنی اور سنہ ستاون
(ii) درگا سہائے سرور اور عروس حب الوطنی
(iii) محمد علی جوہر اور جذبۂ حریت
(iv) شعر حسرت کی سیاسی جہت پر ایک نظر
(v) محروم کی قومی شاعری
(vi) جوش ملیح آبادی! شاعر حریت و انقلاب

حالانکہ مذکورہ شعرا کی شاعری پر دوسرے ابواب میں خاطر خواہ گفتگو ہو چکی تھی لیکن مصنف نے ایک علاحدہ گوشہ قائم کر کے آزادی کے ان عاشقوں کی شاعری کا مفصل مطالعہ پیش کر کے انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

قصہ شیر کا

مصنف: اسرار احمد خاں
صفحات: 212، قیمت: -/51 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66
مبصر: انتخاب احمد، 419/A، گلی نمبر 20، گوتم پوری، سیلم پور، دہلی-110053

اس کتاب کی دلچسپی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ میں نے اسے ایک ہی نشست میں پڑھ لیا۔ کچھ واقعات تو اس انداز میں قلمبند ہوئے ہیں کہ لگتا ہے آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ کوئی شک نہیں بے حد سائنٹیفک انداز میں لکھی ہوئی بے حد دلچسپ کتاب ہے۔ پورا بیان فطری ہے اور شکاری میں مبالغہ آرائی کہیں نظر نہیں آتا۔ اگر مبالغہ کہیں ہے بھی تو اتنے سلیقے سے کہ اسے محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ داستان گو داستان میں شامل ہے اور بیان بھی اس کا ہے مگر اپنے کو ہیرو بنانے کے بجائے اس کے لیے مصنف نے راجہ صاحب کو چھانٹا ہے جو یقیناً ہیرو کہلانے کے مستحق ہیں۔ مصنف ان سے کہیں کہیں ناراض بھی لگتے ہیں مگر عقیدت میں کمی نہیں آتی۔

شکار اور شکار کے دوران پیش آنے والے واقعات کے ساتھ مقامات شکار کا جغرافیہ بھی ہے۔ جنگلات کا محل وقوع، علاقوں کی نسبت سے ان کی خصوصیت، پھر شیر کا مزاج اور عادتیں، اس کے شکار کرنے کے داؤں پیچ، خطرات سے مقابلہ کرنا غرض ہر بیان Exciting ہے اور بے حد دلچسپ۔

سیر وشکار کے واقعات سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے لوگوں کی طرح میں نے بھی کاربٹ اور اینڈرسن کو پڑھا ہے مگر دوسرے شکاری جن کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے میں ان سے واقف نہ تھا۔ یہ لوگ بھی بے شک ماہر شکاری ہوں گے کیونکہ مصنف نے ان کی رائے کو قبول کیا ہے۔ اردو میں میں نے جو کتابیں پڑھی ہیں ان میں اتنی دلچسپ کوئی نہیں لگی جیسی یہ ہے۔ یہاں پر شک کی داستان دوسرے سے بہت مختلف ہے اور ایک نئی سنسنی پیدا کرتی ہے۔ کتاب کے سائڈ ہیرو سراج چچا بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں۔ مصنف نے جب انھیں متعارف کراتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی ناپسندیدہ آدمی کا ذکر ہونے والا ہے۔ مگر وہ تو مصنف کے دل میں جابستا ہے۔ آخری صفحات میں ان کا بیان جس طرح کیا گیا ہے اس سے ایسا لگتا ہے کہ اب انتقال پُرملال کا ذکر آئے گا لیکن مصنف نے نہلا دھلا کر انھیں کھڑا کر دیا ہے۔

مصنف نے واقعی بہت اچھی کتاب لکھی ہے، واقعات سمجھ میں آنے والے اور بیان شگفتہ۔ امید ہے میری ہی طرح جو بھی اس کتاب کو پڑھنا شروع کرے گا ختم کیے بغیر ہاتھ سے نہیں رکھے گا۔ کونسل کی دوسری مطبوعات کی طرح اس کتاب کی قیمت بھی نہایت مناسب ہے۔

بابر کی اولاد (پلے)

پلے رائٹ: سلمان خورشید
تلخیص و ترجمہ: ڈاکٹر اطہر فاروقی
صفحات: 205، قیمت: -/295 روپے
ناشر: روپا اینڈ کمپنی، دہلی
مبصر: جاوید رحمانی، 336 AB، بدھ وہار، نئی دہلی-110067

سلمان خورشید کی شہرت سیاست داں کی ہے اور امیج انگریزی داں اشراف کی۔ ان کے نانا ڈاکٹر ذاکر حسین نیشنلسٹ تھے۔ ذاکر حسین نے اس زمانے میں ہندستانی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر غور کیا جب ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل قطعی غیر یقینی نظر آتا تھا۔ مسلم علاحدگی پسندی اور ہندو ردِ عمل کی شدت اپنے عروج پر تھی، علی گڑھ مسلم لیگ کا گڑھ سمجھا جاتا تھا اور محمد علی جناح اسے اپنا سب سے محفوظ اسلحہ خانہ کہتے تھے۔ علی گڑھ کے قوم پرست طلبہ کے ساتھ مل کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد گاندھی جی اور محمد علی جوہر کے تعاون سے ڈاکٹر ذاکر حسین نے اسی دور میں رکھی۔ تقسیم ہند کے بعد جب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ہندو فرقہ پرستوں کے نشانے پر تھی، ذاکر حسین نے مولانا آزاد اور جواہر لعل نہرو کی وضع کردہ حکمت عملی کے تحت، وائس چانسلر کا عہدہ قبول کرکے آئندہ دس برس تک اس ادارے کی حفاظت کی۔

سلمان خورشید صاحب کے والد قومی سطح پر نہ صرف کانگریس کی سیاست میں رہے بلکہ فطری طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ذاکر حسین کی وراثت کے حقدار بھی ٹھہرے اور اس حیثیت سے وہ کئی دہائیوں تک جامعہ کے چانسلر رہے۔ سیاست سے اپنے والد کے ریٹائرمنٹ کے بعد سلمان خورشید صاحب نے ذاکر صاحب کی سیاسی وراثت کو سنبھال تو لیا اور جذباتی طور پر وہ جامعہ کے خیر خواہ بھی ہیں مگر ان کا جامعہ سے رشتہ دور کا ہے۔ وہ خود جامعہ کے طالب علم بھی نہیں رہے۔ وہ دہلی پبلک اسکول، سینٹ اسٹیفنس کالج اور اوکسفرڈ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں اور مدتِ مدید سے دہلی پبلک اسکول سوسائٹی کے صدر ہیں۔ آزادی کے بعد اگر ہندوستان کے نیشنلسٹ اشراف گھرانوں کا کوئی سماجیاتی مطالعہ کیا جائے تو سلمان خورشید کے خاندان کا پس منظر اس کے لیے بہت معاون ثابت ہوگا۔

'بابر کی اولاد' جو سلمان خورشید کے انگریزی پلے 'Sons of Babur' کا اردو ترجمہ ہے، ان کی شخصیت کے ایک روشن پہلو کو سامنے لاتا ہے۔ یہ پلے بہادر شاہ ظفر کی شخصیت کے گرد گھومتا ہے اور بہادر شاہ ظفر جیسی منفعل بلکہ مضمحل شخصیت کے اس پہلو کو روشن کرتا ہے جسے تاریخ کی مجبوری کا نام دیا جا سکتا ہے۔ سلمان خورشید کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر جیسے شکست

خوردہ کردار پر ایسا معرکے کا رزمیہ لکھ دیا۔ بابر کی اولاد جیسی آر۔ایس۔ایس۔ کی وضع کردہ حقارت آمیز اصطلاح کو اپنی فن کارانہ اور تخلیقی صلاحیت سے سلمان خورشید نے ایسی تخلیقی حرارت بخش دی ہے جس کی مثال ہندوستانی زبانوں کے ادب میں مشکل ہی سے ملے گی۔

یہ پلے ایک یونیورسٹی سے شروع ہوتا ہے جہاں تاریخ کے چند طلبہ جمع ہیں اور انھی میں سے ایک رودرانشو مترا ہے جو ابتدا میں ذرا ابنارمل قسم کا کردار معلوم ہوتا ہے۔ اس کی ذہنی کرید سے شروع ہونے والا یہ پلے قرونِ وسطیٰ تک کے ہندوستان کے سیاسی اور ثقافتی ماضی کا احاطہ کر لیتا ہے۔ سلمان خورشید نے اس نفسیاتی سفر کے لیے رودرانشو مترا کا انتخاب کر کے بڑی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے حالاں کہ اس گروپ میں آفتاب ملک بھی ہے، جس کی تاریخ سے دل چسپی سطحی قسم کی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے تعلق سے جو کرید اور عقیدت رودرانشو مترا کے یہاں ہے، آفتاب ملک کے یہاں اس کا شائبہ بھی موجود نہیں۔ رودرانشو مترا، مذہباً ہندو ہوتے ہوئے بھی اپنی تاریخی اور سیاسی بصیرت کی بنیاد پر بہادر شاہ ظفر کو جدید ہندوستان کا ہیرو اور جمہوریت کے بنیاد گزاروں میں سے ایک سمجھتا ہے۔ وہ بہادر شاہ ظفر کو ایک انوکھے زاویے سے دیکھتا ہے ملاحظہ فرمائیے:

''**بہادر شاہ ظفر:** لڑنے کے لیے بچا ہی کیا تھا؟ شاید اسی لیے ہم انتہائی بے حیائی کے ساتھ تمام تر عزائم سے بے نیاز ہو گئے۔

رودرانشو مترا: لیکن آپ تاریخ کا صرف ایک باب نہیں ہیں، آپ کو تاریخ کا تسلسل بھی نہیں کہا جا سکتا؛ آپ وہ نقطۂ اختتام ہیں جہاں مغل سلطنت تاریخ کا حصہ بن گئی۔ یہ اپنے آپ میں دل چسپ بات ہے۔ ظاہر ہے کہ مغل تاریخ میں اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ آپ کے ساتھ ہی تہذیب کی تاریخ کا ایک باب مکمل ہو جاتا ہے: یہ تہذیب جو نور و ظلمت میں بہم معرکے سے گزرتی ہوئی اس کل کی طرف پیش قدمی کرے گی جس میں اقتدار کی بنیاد انسانیت پر ہوگی اور شخصی آزادی جس کا طرۂ امتیاز ہوگا۔''

(ص ص 111-110، بابر کی اولاد)

رودرانشو قرونِ وسطیٰ کی موجود تاریخوں سے مطمئن نہیں۔ اس کے ذہن پر بہادر شاہ ظفر کی عظمت کا نقش اتنا گہرا ہے اور بہادر شاہ ظفر اس کے اعصاب پر اس طرح سوار ہو جاتے ہیں کہ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بار بار ان سے ملاقات کر رہا ہے اور یہ پلے بیک وقت دو الگ الگ زمانوں میں چلتا رہتا ہے۔

اس پلے کی شدید ضرب فرقہ وارانہ ذہنیت پر پڑتی ہے اور پلے میں خصوصاً مراٹھوں کے تعلق سے جو سوال اٹھایا گیا ہے وہ انتہائی معنی خیز ہے: اس کی روشنی میں مغلوں کی معنویت کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔ سیاسی بصیرت سے محروم ہمارے بیش تر مورخین نے دوسروں کے لیے بھی تاریخ کے اس دور کو جس میں مسلمانوں کا فیصلہ کن رول رہا ہے، ہندوستانی مسلمانوں کے ماضی کے کفن میں تبدیل کر دیا ہے۔

ہندوستان میں حب الوطنی اور فرقہ واریت/ مذہبی عصبیت جیسے موضوعات پر ازسرِ نو غور کرنے کی ضرورت آج پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ مراٹھوں، جاٹوں اور سکھوں کی مسلسل یورشوں نے اس عظیم تہذیب کو پامال کیا جسے گنگا جمنی ثقافت کہا جاتا ہے۔ سلمان خورشید نے اس پلے میں اس نکتے کو بڑی خوبصورتی سے ابھارا ہے:

"**بہادر شاہ ظفر:** یہ ایک بہت ہی سفاک سچائی ہے لیکن پھر بھی عوام کو ایک شہنشاہ کی ضرورت تھی جو ان پر حکمرانی کرے۔ حکمرانی کرنے والے شہنشاہ کی موجودگی ہندوستانی عوام کی گھٹی میں تھی۔ اسی لیے تو انگریز یہاں کامیاب ہو گئے۔ شہنشاہ کا تصور حکومت کرنے اور نظام چلانے کے لیے بے حد ضروری تھا۔ صرف شہنشاہ کے نام سے، خواہ وہ میری طرح بالکل ہی کمزور کیوں نہ ہو، وہ تمام کام ہو سکتے تھے جنھیں بڑی سے بڑی فوجیں نہیں کر سکتی تھیں۔ افغانستان جیسے ملک جہاں عوام کے ذہن ہندوستان سے مختلف تھے وہاں انگریزوں نے خون تھوک دیا اور ایک انچ زمین پر بھی پوری طرح قابض نہ ہو سکے۔ ہندوستان میں بادشاہ اور اس کی حکمرانی کا تصور اس وقت اتنا مستحکم تھا کہ نہ تو کوئی طاقت ور سے طاقت ور فوج اور نہ ہی کوئی دھار دار تلوار اسے ختم کر سکتی تھی۔ ناقابلِ تسخیر بنے رہنے اور اپنے وجود کا جواز برقرار رکھنے کے لیے انھیں ایک علامت کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ علامت آخری بے بس مغل تاجدار ہی کیوں نہ ہو۔

رودرانشو مترا: لیکن جہاں پناہ! افغان، مراٹھے اور برطانوی اپنے سلسلۂ حکمرانی کو کیوں نہیں فروغ دے سکے؟ میرا مطلب ہے 1857 تک ہی یا بہادر شاہ ظفر...

بہادر شاہ ظفر: تم نے دیکھا نہیں؟ شہنشاہ کی شخصیت کو نقصان تو پہنچایا جا سکتا تھا، اسے ہراساں بھی کیا جا سکتا تھا لیکن اس ذہنی رویے کو وہ چھو بھی نہیں سکے۔ دراصل شہنشاہ ہندوستان کی روح تھا اور اسے قیدی بنا کر انگریز یہ دعویٰ کر سکتے تھے کہ انھوں نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا ہے مگر ایسا کیے بغیر مسلسل کوششوں کے باوجود وہ ہماری ایک انچ زمین پر

بھی قابض نہیں ہو سکتے تھے، وہ ہمیشہ اجنبی ہی رہتے۔ دراصل شہنشاہِ ہندوستان کو شکست دینا ہی انگریزوں کی سب سے بڑی فتح تھی۔ اس کے بعد عوام کے حوصلے مکمل طور پر پست ہو گئے لیکن انگریز ہندوستان میں ہمیشہ غیر ملکی ہی رہے۔ انھیں ہندوستانی تصور کر لینا کبھی ہندوستانی عوام کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آیا۔

ردرانشو مترا: اور وہ ہندوستان میں ہمیشہ جدوجہد کرتے رہے؟ یہ خاصی دل چسپ بات ہے۔ آپ کے اجداد تو ایک دور دراز مقام سے آئے تھے لیکن کم از کم مراٹھے تو مقامی ہی لوگ تھے، اس کے باوجود مراٹھے کبھی متحدہ ہندوستان اور اس کی خود مختاری کی علامت نہ بن پائے۔

بہادر شاہ ظفر: مغل متحدہ اور عظیم ہندوستان کے تصور کی علامت ہی نہیں تھے، انھوں نے اس نظریے کو مجسم کر دیا تھا۔

ردرانشو مترا: عالی جاہ، یہی وہ نظریہ ہے مجھے جس کی ضرورت تھی، میں اسی کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ اب اس نظریے کی ہندوستان میں واپسی ہونی چاہیے۔''

(ص ص 182-181، بابر کی اولاد)

ہندوستان میں جس مشترکہ تہذیب کی بات کی جاتی ہے اس کی بنیاد مغلوں نے نہ صرف رکھی بلکہ سیکڑوں برس تک اسے مستحکم ثقافتی اور سیاسی بنیادوں پر استوار بھی کیا۔ آزادی کے بعد اگر ہندوستان ایک سیکولر جمہوری ریاست بن سکا تو اس کی بنیاد میں وہی مشترکہ تہذیب تھی جس کے بنیاد گزار مغل تھے۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں سکھوں کا رول خاصا عجیب و غریب رہا ہے جس کی فطری وجوہ ہیں اور مسلمانوں کو بھی تاریخ کے معروضی مطالعے کے لیے انھیں قبول کرنا چاہیے۔ سکھوں کے ذہن کا اندازہ دہلی کی تاراجی کے بعد کے اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے جب ہوڈسن نے ہمایوں کے مقبرے سے مغل شاہزادوں کو اس وعدے کے ساتھ گرفتار کیا کہ ان کا فیصلہ باقاعدہ عدالت میں کیا جائے گا لیکن ہمایوں کے مقبرے سے صرف پانچ میل دور پہنچنے کے بعد:

''ہوڈسن نے رتھ کو سپاہیوں کے گھیرے میں لے لیا اور شاہزادوں کو باہر آنے کا حکم دیا۔ ان کے باہر آتے ہی ان سے ہتھیار چھین لیے گئے اور انھیں کپڑے اتارنے پر مجبور کر کے دوبارہ رتھ میں بیٹھنے کو کہا گیا۔ ان کے رتھ میں بیٹھتے ہی ہوڈسن نے بذاتِ خود ان کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ شاہزادوں کا اسلحہ، کپڑے اور زیورات سمیٹنے کے بعد ہوڈسن شہر پہنچا اور شاہزادوں کی لاشوں کو شہر کے تھانے کے سامنے ڈال دیا۔ (یہ لاشیں اس وقت تک وہاں پڑی رہیں جب تک حفظانِ صحت کا خطرہ لاحق نہ ہو گیا۔) یہ وہی جگہ تھی جہاں دو سو سال قبل اورنگ زیب نے سکھوں کے گرو تیغ بہادر کے سر کو رکھا تھا۔ اس اتفاق پر سکھ بہت مسرور ہوئے۔ ہوڈسن بھی خاندانِ تیموریہ کے آخری چراغ بجھا کے بے حد مسرور تھا۔''

(بحوالہ سن ستاون کی دلی، ص 85، دریافت اگست 2006، اسلام آباد نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز)

سلمان خورشید کے اس پلے کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے ہندوستان میں مغلوں کی معنویت سمجھ میں آتی ہے۔ پلے کے قارئین کی بڑی تعداد چوں کہ انگریزی داں لوگوں کی ہوگی یوں اس پلے کی سماجی معنویت بھی مسلم ہے۔

تخلیقی سطح پر سلمان خورشید کا یہ پلے ایک شاہ کار ہے اور اس میں جو تاریخی بصیرت اور جیسا تخلیقی دفور ہے ان دونوں کی ایسی ہم آہنگی معاصر اردو ڈرامے کی تاریخ میں موجود نہیں۔

اس پلے کا نہایت کامیاب اردو ترجمہ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کیا ہے۔ ترجمے کی زبان اتنی پُر شکوہ ہے کہ وہ قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور ہمیں اس عہد میں پہنچا دیتی ہے، جس عہد کا یہ رزمیہ ہے۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی کے ترجمے میں اس قدر روانی ہے کہ اس پر ترجمے کا گمان نہیں گزرتا اور یہی مترجم کا کمال ہے۔ یہ ترجمہ جتنی آزادہ روی کے ساتھ اور جیسے تخلیقی انداز میں کیا گیا ہے اس سے یہ پتا بھی چلتا ہے کہ مترجم کی نگاہ میں ترجمہ ایک تخلیقی عمل ہے، یہ اصل متن کا لحاظ تو رکھتا ہے لیکن اصل متن کا غلام نہیں ہوتا۔

انگریزی میں پلے اور ڈراما دو الگ الگ اصناف ہیں۔ پلے کو ڈراما کہنا بالکل ایسا ہے جیسے نظم کو غزل کہہ دیں مگر اردو میں لفظ 'پلے' رائج نہیں۔ اس ترجمے میں پلے اور پلے رائٹ (Playwright) کے الفاظ ہی استعمال کیے گئے ہیں۔ اس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں لفظ ''پلے'' بھی شامل ہو جائے گا۔ مغل دربار میں فارسی کی اجارہ داری تھی اور اسی لیے پلے کے اردو ترجمے میں فارسی ترکیبوں کی کثرت ہے جو پلے کے تاریخی پس منظر سے مترجم کی واقفیت کا ثبوت ہے۔

امید ہے کہ 'بابر کی اولاد' کا اردو حلقوں میں زبردست خیر مقدم کیا جائے گا جیسا کہ انگریزی میں "Sons of Babur" کا کیا جا رہا ہے۔

اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857

مصنف: معصوم مرادآبادی

صفحات: 191، قیمت:-/100 روپئے

ناشر: خبردار پبلیکیشنز، میٹروپول مارکیٹ، موتی محل اسٹریٹ، دریا گنج، دہلی-2

مبصر: سہیل انجم، D-78-A، شاہین باغ، ابوالفضل-II، جامعہ نگر، اوکھلا، دہلی

2007 میں جب ملک گیر پیانے پر 1857 کی جنگ آزادی کا ڈیڑھ سو سالہ جشن منایا جارہا تھا تو اردو حلقوں کی جانب سے جگہ جگہ کانفرنسوں اور سیمیناروں کا بھی اہتمام کیا گیا تھا جن میں اس عہد کی اردو صحافت پر بھی مقالے اور مضامین پیش کیے گئے تھے، تاہم وہ بکھرا ہوا کام تھا۔ کسی نے کسی موضوع پر اظہار خیال کیا تو کسی نے کسی موضوع پر۔ اگرچہ ان میں اردو صحافیوں کی قربانیوں کو بھی اجاگر کیا گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس جنگ کی چنگاری کو اردو اخبارات ہی نے شعلہ بنایا تھا پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا آتش فشاں پھوٹ پڑا تھا۔ وہ اردو اخبارات ہی تھے جو جنگ آزادی کا صور پھونک رہے تھے اور مجاہدین کے دلوں میں آزادی کا الاؤ روشن کررہے تھے۔ وہ اردو صحافی ہی تھے جو اس ''جرم عظیم'' کی پاداش میں فرنگیوں کے ظلم و استبداد کے شکار بن رہے تھے اور دارورسن کو لبیک کہہ رہے تھے۔ بقول معصوم مرادآبادی ''یہ اردو صحافت کا ابتدائی زمانہ تھا اور ابھی اس کے بال و پر بھی پوری طرح نہیں نکل پائے تھے کہ اپنی ابتدا ہی میں اردو صحافت کو ایک بڑے چیلنج سے گزرنا پڑا جس سے اردو صحافت میں ایک بے مثل جرات و بے باکی پیدا ہوئی اور اس طرح ظالم حکمراں کے سامنے کلمۂ حق ادا کرنے کی ذمے داری سب سے پہلے اردو صحافت نے اپنے کاندھوں پر لی۔ ملک کی جدوجہد آزادی میں اردو صحافت نے مجموعی طور پر جو قائدانہ کردار ادا کیا ہے وہ ہندوستان کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔''

ہندوستان کی اولین جنگ آزادی میں اردو کے کردار پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، ان میں کتابیں بھی ہیں اور رسائل و جرائد کے خصوصی شمارے بھی، لیکن ایک اہم کام جو ابھی باقی تھا وہ اب معصوم مرادآبادی کے قلم سے مکمل ہوا ہے۔ کتاب کا مقدمہ بزرگ صحافی جناب جی ڈی چندن کے قلم سے ہے جس میں انھوں نے جنگ آزادی 1857 میں اردو صحافت کے قائدانہ کردار پر کھل کر روشنی ڈالی ہے اور اس کے ساتھ ہی مذکورہ کتاب پر بھی اپنی تفصیلی رائے دی ہے۔ اولین جنگ آزادی اور اردو صحافت چندن صاحب کا خصوصی موضوع ہے۔ لہٰذا اگر مقدمہ کسی اور سے لکھوایا گیا ہوتا تو اس موضوع کے ساتھ ناانصافی ہوتی۔ معصوم مرادآبادی نے جہاں اس کتاب میں اردو صحافت کی خوں چکاں تاریخ کو قلمبند کیا ہے وہیں انھوں نے اس کے حوالے سے اس عہد کی سماجی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثال کے طور پر ''پس منظر'' کے عنوان سے انھوں نے ''چربی والے کارتوس''، ''بغاوت کی شروعات''، ''دلی کے لیے جدوجہد'' بہادر شاہ ظفر کے آخری ایام، دہلی میں قتل و غارت گری اور ویران دہلی شہر پر قہر کے ذیلی عنوانات سے انتہائی معلومات افزا تفصیلات پیش کی ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے آخری ایام سے متعلق اقتباسات پڑھ کر آنکھیں نم ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح دہلی شہر کے حالات بھی خون کے آنسو رلانے والے ہیں۔ انھوں نے اردو صحافت کے ارتقا پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ چونکہ معصوم مرادآبادی کو اس کتاب کی تصنیف کی تحریک، مولوی محمد باقر پر دہلی کے پریس کلب میں منعقد ایک تقریب سے ملی، لہٰذا انھوں نے مولوی باقر پر ایک تفصیلی مضمون سپرد قلم کیا ہے جو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں شہادت کا منظر، ٹیلر کا قتل، مولوی باقر کا خاندان، تعلیم و تربیت، بہادر شاہ ظفر سے قربت اور انگریز پرستی کے الزامات جیسے ضمنی عنوانات سے تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ معصوم مرادآبادی کے مطابق ''گیارہ مئی 1857 کو جب دہلی میں شورش کا آغاز ہوا تو مولوی باقر نے اپنے اخبار کو ہی نہیں بلکہ خود کو بھی اس لڑائی کے لیے وقف کردیا تھا۔ مولوی باقر کی شہادت کے بارے میں بعض کتابوں میں لکھا گیا ہے کہ پرنسپل ٹیلر نے اپنے آخری وقت میں کچھ کاغذات مولوی باقر کے حوالے کیے تھے اور کہا تھا کہ دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہونے کے بعد جو پہلا انگریز افسر تم کو ملے اسے یہ کاغذات دے دینا۔ انھی میں ایک کاغذ یہ بھی تھا کہ مولوی باقر نے اس کی جان بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ جب انگریز افسر نے اسے پڑھا تو انھیں فوراً گولی ماردی۔ لیکن معصوم مرادآبادی نے لکھا ہے ''مولوی باقر کو جنرل ہڈسن نے اس وقت گولی نہیں ماری تھی جب وہ پرنسپل ٹیلر کا سامان لے کر گئے تھے، بلکہ ان کی شہادت کا واقعہ انھیں حراست میں لینے کے بعد کا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان کو گرفتار کرنے کے بعد ان کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں چلا اور نہ ہی انھیں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا گیا بلکہ انتہائی ظالمانہ طریقے سے انھیں 77 سال کی پیرانہ سالی میں نہایت سفاکی سے شہید کردیا گیا۔'' چونکہ انھوں نے ہر بات تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد لکھی ہے اس لیے اس پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

آخر میں اس وقت کے اردو اخبارات کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں صادق الاخبار، پیام آزادی، سراج الاخبار، کوہ نور، طلسم لکھنؤ، سحر سامری، رسالہ بغاوت ہند، عمدۃ الاخبار اور چشمۂ فیض شامل ہیں۔ ان میں سب سے اہم مضمون ''پیام آزادی'' سے متعلق ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں: ''تحریک آزادی 1857 میں نئی روح پھونکنے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پرچم تلے جمع کرنے کے سلسلے میں ''پیام آزادی'' کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

بہادر شاہ ظفر کے پوتے مرزا بیدار بخت کے قلم سے اس اخبار کی اشاعت فروری 1857 میں شروع ہوئی تھی۔ اس کے پبلشر گو کہ مرزا بیدار بخت تھے لیکن اس کے خاص نگراں عظیم اللہ خاں تھے۔" مذکورہ اخبار پر پہلی بار روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب تک یہ اخبار لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ اس اخبار سے انگریز اس قدر خائف تھے کہ دہلی پر دوبارہ تسلط قائم ہونے کے بعد گھروں کی تلاشی کی جاتی اور جن کے گھروں میں اس اخبار کا کوئی شمارہ مل جاتا انھیں پھانسی دے دی جاتی۔ یہ دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخطوں میں شائع ہوتا تھا اس لیے اسے ہندی اردو صحافت کی مشترکہ میراث بھی کہا گیا ہے۔ کتاب میں "کوہ نور" نامی ایک ایسے اخبار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو انگریزوں کا زبردست پٹھو تھا اور جو مجاہدین کو نمک حرام، مفسد اور غدار کے القاب سے نوازتا تھا۔ اس نے دہلی پر انگریزوں کے دوبارہ قبضے کے بعد ایک خصوصی ضمیمہ شائع کیا اور انگریزوں کے جشن فتح میں تحریری طور پر شامل ہوا۔ تاہم نصف صدی سے زائد عرصے تک نکلنے والے اس اخبار کی اردو صحافت کے تئیں خدمات بھی ہیں جن کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔

1857 کی جنگ آزادی اور اردو صحافت کے موضوع پر یہ ایک ایسی تصنیف ہے جو حوالہ جاتی کتاب کے طور پر زندہ رہے گی اور اس موضوع پر تحقیقی کام کرنے والا کوئی بھی شخص اس کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

□□□

منتخب التواریخ (جلد اوّل، دوم وسوم)

مؤلف: ملا عبدالقادر بدایونی / مترجم: ڈاکٹر علیم اشرف خاں

عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نہ صرف باکمال شاعر تھے بلکہ تاریخ نویسی میں بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ معروف مورخ ابوالفضل کے ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں بھی اکبری دربار میں رسائی حاصل تھی۔ انھیں ترجمہ اور تالیف پر مامور کیا گیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے تاریخ الفی، رزم نامہ، جامع رشیدی اور بحرالاسمار جیسی کتابیں لکھیں۔ اکبری عہد کی ساٹھ سالہ تاریخ سے آگاہی کے لیے ابوالفضل کے "اکبرنامہ" کے ساتھ ساتھ ملاّ عبدالقادر کی "منتخب التواریخ" (تین جلدوں میں) کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ملاّ عبدالقادر نے یہ تاریخ شاہی محل میں بیٹھ کر نہیں لکھی جو بادشاہ اکبر کی پسند و ناپسند سے گزرتی بلکہ آزادانہ تحریر کی اور یہی آزادانہ رائے اس کتاب کو "اکبرنامہ" سے منفرد کرتی ہے۔

صفحات: جلد اوّل 409 / جلد دوم وسوم 620، قیمت: جلد اوّل -/335 روپے / جلد دوم وسوم 555 روپے

جتنے پاس اتنے دور

مصنف: دھیریندر سنگھ جفا

"جتنے پاس اتنے دور" انڈین فائٹر پائلٹ کی آپ بیتی ہے جو ناول کے اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب دھیریندر سنگھ جفا نے پہلے انگریزی میں لکھی بعد میں ڈی. گھانے اسے بنگلہ میں ترجمہ کیا، پھر ہندی ترجمہ خود مصنف نے اپنے دوست سید مزمل فدا کے تعاون سے کیا اور اب اردو ترجمہ جناب شاہد جمال نے کیا ہے جسے قومی اردو کونسل نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔

اس آپ بیتی میں 1970 سے 1972 تک ہندوستان اور پاکستان کی جنگوں کے توسط سے تقسیم شدہ ہندوستان کے ٹوٹے بکھرے دلوں کی آہوں اور کراہوں کو بڑی صفائی اور صدق دلی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنے ملک کی حفاظت اور انسانی رواداری کے باب میں ہمارے جذبے اور احساس پر گہرے اثرات مرتسم کرتی ہے۔

صفحات: 270، قیمت -/145 روپے

عبدالعلیم قدوائی

قدرت کا عجوبہ

شہد کی مکھی ایک نقطے کے برابر ننھے منے سفید انڈے سے پیدا ہوتی ہے۔ چھ دن تک یہ لاروا کے روپ میں رہتی ہے اور روزانہ 1300 مرتبہ وٹامن سے بھرپور جیلی جو چھتہ کی بڑی مکھیاں برابر بناتی رہتی ہیں، کھاتی ہے اور ہر روز اس کا وزن پانچ گنا بڑھ جاتا ہے۔ چھتے کے اندر 35° سینٹی گریڈ کا درجۂ حرارت قائم رہتا ہے۔ ساتویں دن سے یہ مکھی شہد اور پھول کے ذرون (زرگل) کا بنا ہوا کھانا کھانے لگتی ہے۔ نویں دن اس کے جسم کے اردگرد موم سے بنا ہوا ایک ریشمی کوریا (غلاف) لپٹ جاتا ہے۔ اور یہ پیوپا کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بیس دن کی مدت گزرنے کے بعد یہ پورے طور پر شہد کی مکھی بن جاتی ہے جو اپنے سر کے ذریعے چیزوں کو محسوس کرتی ہے اور بو سونگھتی ہے۔ اس کے سر پر پانچ آنکھیں، تین داہنی طرف اور دو دوسری طرف ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ زبان، جبڑے پر، پیر اور ایک ڈنک بھی ہوتا ہے۔ شہد کی مکھیاں چھتے میں مختلف قسم کے کام انجام دیتی ہیں اور ان کے کام آپس میں بٹے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلا کام چھتے کی صفائی کا ہوتا ہے اس کے بعد لاروے کی دیکھ بھال، جیلی اور شہد بنانے کے کام ہوتے ہیں۔ شہد پھولوں کے رس سے حاصل ہوتا ہے جس میں پانی، گلوکوز، سکروز اور بڑی تعداد میں وٹامن پائے جاتے ہیں۔

چھتہ کے اندر روزانہ ہزاروں مکھیاں مرتی اور پیدا ہوتی رہتی ہیں اور یہ سارے کام بڑے سلیقے سے ہوتے رہتے ہیں ان کی ایک ملکہ ہوتی ہے جو تقریباً 2000 انڈے روزانہ دیتی ہے، اس کے جسم سے ایک خاص قسم کا مادہ نکلتا ہے جس کو تمام مکھیاں روزانہ برابر چکھتی رہتی ہیں۔ جو مکھیاں کسی روز اس کو نہیں چکھ پاتی ہیں وہ انڈے دینے لگتی ہیں۔ زیادہ تر مکھیاں مادہ ہوتی ہیں۔ اپنی پیدائش کے ٹھیک 35 ویں دن سے مکھی موم بنانے لگتی ہے۔ جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ موم ان کے پیروں کے بالوں سے نکلتا ہے جس کو وہ چھتے کے شش پہل خانوں میں جمع کرتی ہے۔ ایک چھتے میں تقریباً 35 ہزار خانے ہوتے ہیں جن میں آدھا کلو موم اور 10 کلو شہد جمع رہتا ہے۔ ساڑھے تین کلو شہد سے آدھا کلو موم نکلتا ہے۔ جن خانوں میں مادہ مکھیاں رہتی ہیں وہ افقی شکل کے اور جن میں ملکہ رہتی ہے وہ عمودی یعنی اوپر سے نیچے کی طرف ہوتے ہیں۔ 37 ویں دن شہد کی مکھی چھتہ سے نکل کر فضا میں اڑان شروع کرتی ہے اور ایک سیکنڈ میں 250 دفعہ ہوا کے بہاؤ کے ساتھ مڑتی رہتی ہے اور اس کی رفتار 15 کلومیٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ وہ بڑی آسانی سے جب اور جہاں چاہے رک سکتی ہے۔ مکھیاں ایک دوسرے کو سونگھ کر پہچانتی

ہیں اور کسی غیر جنس کو چھتہ کے اندر نہیں آنے دیتی ہیں۔ شہد کی مکھی کا ڈنک زہریلا ہوتا ہے وہ عام طور پر نہیں کاٹتی مگر چھتہ نکالنے والوں اور اپنے دشمنوں کو غصے کی حالت میں بری طرح زخمی کرتی ہے اور اس سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اپنی زندگی کے چالیسویں دن مکھی پھولوں سے شہد جمع کرنا شروع کرتی ہے۔ وہ پھولوں کو رنگ اور بو سے پہچانتی ہے اور اپنی زبان سے ان کا رس چوستی ہے۔ اسی کے ساتھ ہی پھولوں کے ریزے زرگل اس کے بالوں میں چمٹ جاتے ہیں، ان ریزوں کا کچھ حصہ وہ ایک پھول سے دوسرے پھول میں منتقل کر دیتی ہے جس سے پھولوں کی افزائش یا پیدائش ہوتی رہتی ہے۔ اندازاً ایک مکھی ایک دن میں 20000 پھولوں سے رس اور پھول کے ٹکڑے جمع کر لیتی ہے۔ مکھیاں ایک قطار کی شکل میں اپنے چھتہ کی طرف آسانی سے واپس آجاتی ہیں۔ بیس دن شہد جمع کرنے کے بعد مکھی کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اس مدت میں وہ 2000 کلومیٹر کی مسافت طے کر لیتی ہے اور 50 گرام شہد تیار کر لیتی ہے۔ ان اعداد کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ ایک چھتے کی مکھیاں کم سے کم ایک کلو شہد دن بھر میں بنا لیتی ہیں۔ کیا یہ کام علم اور عقل رکھنے والے انسان کر سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔

غرض شہد کی مکھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عجیب وغریب نمونہ ہے قرآن مجید کی سورہ نحل میں اس کا ذکر مدح کے ساتھ کیا گیا ہے اور شہد کو تمام لوگوں کے لیے شفا قرار دیا گیا ہے۔

بچو تم کو شہد کی مکھی کی بامقصد زندگی، محنت اور لگن سے سبق لینا چاہیے۔ دو مہینے کی مختصر مدت میں کتنا کام کر لیتی ہے۔ اس کا چھتہ بڑا خوبصورت ہوتا ہے اور کاریگری کا بہترین نمونہ ہے۔ شہد اور موم دونوں ہمارے لیے نہایت کارآمد اور مفید چیزیں ہیں۔ جن کے لیے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

بھالو کو شہد بہت پسند ہے اور وہ اکثر درخت پر چڑھ کر شہد کی لالچ میں چھتوں کو برباد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شہد کی مکھیاں اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہیں۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ بھالو کے جسم پر بڑے بڑے بال ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ان کے ڈنک سے بڑی حد تک بچا رہتا ہے مگر پیٹ اور منھ پر وہ مکھیوں کے حملے کی تاب نہیں لاسکتا اور اکثر اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے کہ اتنا بڑا جانور ان چھوٹی چھوٹی مکھیوں کے ہاتھوں بے بسی سے مارا جاتا ہے۔

(ترکی مصنف محمد سمشیق کے مضمون کی تلخیص)

□□□

پتہ:
Zahida Manzil, Aligarh

کتب فروشوں اور ادب کے قارئین کے لیے خوشخبری

قومی اردو کونسل کی مندرجۂ ذیل مطبوعات 75 فیصد کمیشن پر طلب کی جاسکتی ہیں

اپنی ضرورت کی کتابوں کا آرڈر آج ہی بھجوائیں

نمبر شمار	کتاب کا نام	قیمت اصل	قیمت مابعد رعایت 75%
01	آزادی	52.00	13.00
02	آزادی کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی	123.00	31.00
03	افغانستان میں جدید دری فارسی شاعری	80.00	20.00
04	عہدِ ناظم کتب خانہ داری ایک تعارف	55.00	14.00
05	علی وردی اور اس کا عہد	86.00	22.00
06	عشری درجہ بندی	167.00	42.00
07	آڈیٹنگ کے بنیادی اصول	331.00	83.00
08	برقی توانائی	94.00	24.00
09	بھارت 2001	250.00	63.00
10	بھارت 2002	250.00	63.00
11	چولا راجگان	209.00	52.00
12	ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا: حیات اور کارنامے	69.00	17.00
13	فلسفیانہ تجزیہ: ایک تعارف	120.00	30.00
14	فیودر دستوئیفسکی	52.00	13.00
15	غرائب الجمل	76.00	19.00
16	گلشنِ بے خار	128.00	32.00
17	ہمارا قدیم سماج	54.00	14.00
18	ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	33.00	08.00
19	ہندوستان کی قانونی تاریخ (جلد اول، دوم)	262.00	66.00
20	ہندوستان میں چھاپہ خانہ	52.00	13.00
21	ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا	95.00	24.00
22	ہندوستانی معیشت	134.00	34.00
23	ہندوستانی مصوری عہدِ مغلیہ میں	158.00	40.00
24	ہندوستانی مصوری: ایک خاکہ	130.00	33.00
25	حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات	92.00	23.00
26	ابتدائی علمِ شہریت	47.00	12.00
27	انسانی ارتقا	70.00	18.00
28	انتظامی قانون کے اصول	120.00	30.00

29	جامع انگریزی اردو ڈکشنری (جلد۔6-1)	3400.00	850.00
30	جامع اردو انسائیکلو پیڈیا (جلد۔4-1 اور 8-6)	1790.00	448.00
31	جنت سنگار	180.00	45.00
32	کلیات پریم چند (جلد 1 تا 24)	4071	1018.00
33	للو لال جی ایک ادبی سوانح	72.00	18.00
34	لغت ابجد شماری (جلد۔1، حصہ دوم) لغت ابجد شماری (جلد۔2، حصہ اول و دوم)	387.00	97.00
35	مجموعہ نغز	268.00	67.00
36	مسدود راہیں	126.00	32.00
37	مثنوی بہرام وگل اندام	66.00	17.00
38	مولیئر	57.00	14.00
39	مسلم ہندوستان کا زراعتی نظام	92.00	23.00
40	اڑیسہ میں اردو	157.00	39.00
41	پشکن	60.00	15.00
42	قدیم ہندی فلسفہ	82.00	21.00
43	قدیم ہندوستان میں شودر	82.00	21.00
44	قومی زبان	76.00	19.00
45	قواعد کیٹیلاگ سازی	268.00	67.00
46	صنعتی تنظیم اور انتظام	149.00	37.00
47	سیر کہسار	167.00	42.00
48	طبیعیات کے بنیادی تصورات	82.00	21.00
49	تمل ناڈو میں اردو	135.00	34.00
50	تنقید عقل محض	158.00	40.00
51	تاریخ طبعی (جلد۔1)	43.00	11.00
52	تاریخ فلسفہ سیاسیات	97.00	24.00
53	تشریحی تصاویر	66.00	17.00
54	توضیحی لسانیات	136.00	34.00
55	تذکرۂ مخطوطات (جلد۔5-1)	431.00	108.00
56	تالستائے	46.00	11.00
57	اصول معاشیات	47.00	12.00
58	اتر پردیش کے لوک گیت	120.00	30.00
59	وجے نگر کے عہد میں نظام حکومت	118.00	30.00
60	وادئ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	45.00	11.00
61	وضاحتی کتابیات (جلد 1، 3-22)	2650.00	663.00

62	زراعتی انکشافات	192.00	48.00
63	آسان اردو شارٹ ہینڈ	92.00	23.00
64	عکس اور برعکس	128.00	32.00
65	امریکی ادب کا مختصر جائزہ	52.00	13.00
66	بھارت 2004	250.00	63.00
67	دھوپ چولھا	38.00	10.00
68	اجارہ	131.00	33.00
69	فسانۂ آزاد جلد 1 تا 4	1163.00	291.00
70	ہندوستانی سرزمین اور عوام	30.00	08.00
71	ہندوستان کا صنعتی ارتقا	130.00	33.00
72	ہندوستان میں بیوپاری کارپوریشن	188.00	47.00
73	ابتدائی سماجیات	43.00	11.00
74	ارتقائے کائنات انسان ودیگر مضامین	94.00	24.00
75	جدید ابتدائی منطق	57.00	14.00
76	جان کمپنی سے جمہوریہ تک	114.00	29.00
77	کائنات جلیل	80.00	20.00
78	کتب خانہ داری ایک تعارف	108.00	27.00
79	معاشیات کے بنیادی اصول	82.00	21.00
80	مسلمانوں کے سیاسی افکار اور ان کا انتظام حکومت	82.00	21.00
81	پیمائش ونقشہ کشی	85.00	21.00
82	قدیم ہندوستان کی تاریخ	114.00	29.00
83	قدیم تامل ناڈو میں عربی وفارسی	98.00	25.00
84	سفرنامہ فرہنگ مسیر طالبی	73.00	18.00
85	شہیدان آزادی (جلد اول ودوم)	213.00	53.00
86	شخصیت کے نظریات	92.00	23.00
87	شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال	150.00	38.00
88	سخنوران گجرات	77.00	19.00
89	تاریخ ہندی فلسفہ (جلد اول)	89.00	22.00
90	تاریخ آصفی	58.00	15.00
91	اجرتیں	95.00	24.00
92	جدید ہندوستان کے سماجی وسیاسی افکار	178.00	45.00
93	جنوبی ہند کی تاریخ	114.00	29.00

یہ رعایت 31 مارچ 2009 تک دی جائے گی۔

نوٹ: محصول ڈاک اور محصول مال برداری (Transportation) خریدار کے ذمے ہوگا، کتابوں کی قیمت پیشگی روانہ کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-8، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

میٹنگ کے ایجنڈے پر غور کرتے ہوئے کونسل کی جنرل باڈی کے ممبران۔

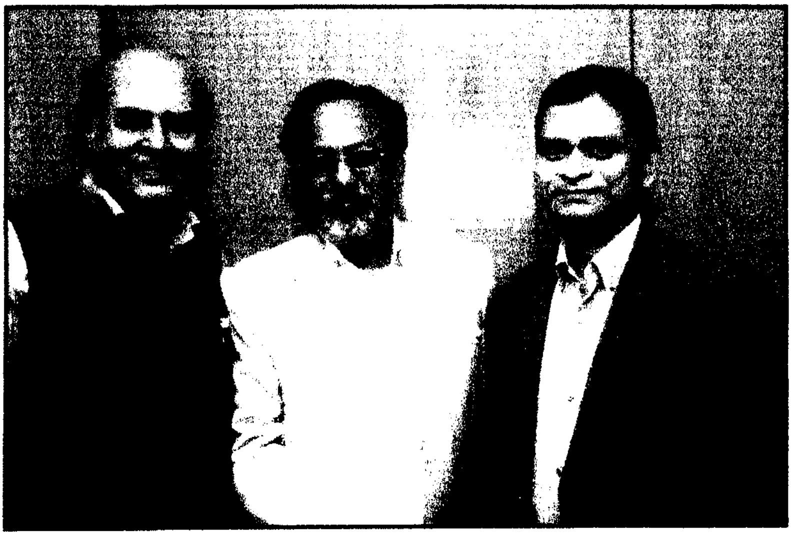

(دائیں سے) ڈاکٹر ابوبکر عباد، پرنسپل پبلی کیشنز آفیسر قومی اردو کونسل، جناب چندر بھان خیال، وائس چیئرمین قومی اردو کونسل اور جناب زبیر رضوی ممبر، جنرل باڈی قومی اردو کونسل ایک غیر رسمی ملاقات کے دوران۔

Date of Publication : 24/12/2008
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, January 2009, Vol. 11, Issue: 1
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

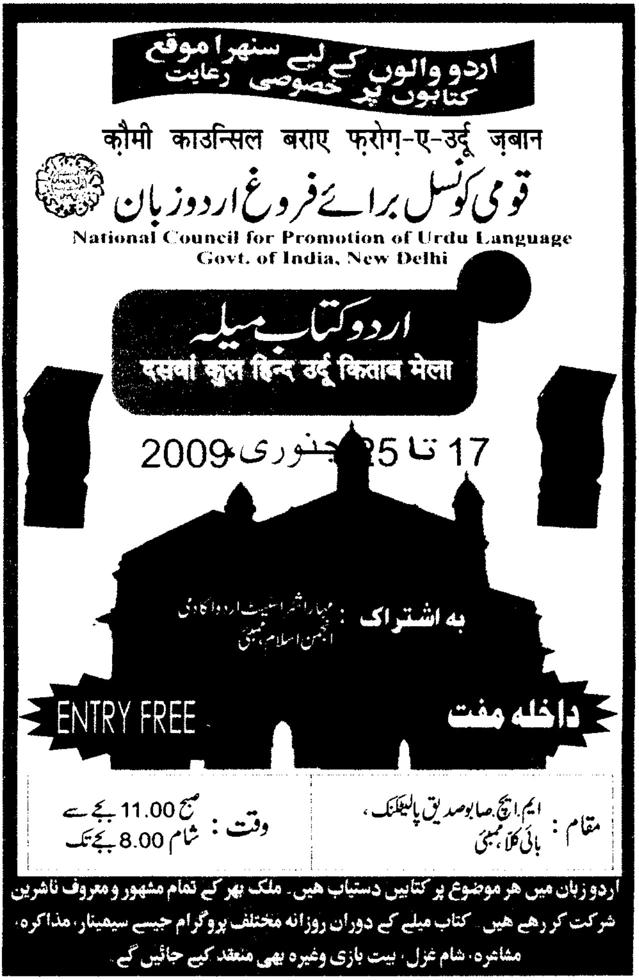

Printed and Published by Dr. AliJaved, Director, NCPUL on behalf of NCPUL West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 70 GSM Paper produced by Khanna Paper Mills Pvt. Ltd., Amritsar Editor: Dr. Ali Javed, Tel: 26103381, 26103938